رسالہ

تحقیقاتِ اسلامی

زیرِ سرپرستی

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

مرتّب

مولانا محمد صغیر قاسمی



بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن دعوت الی الحق کیرانہ ضلع شاملی کا
علمی، دینی، تحقیقی واصلاحی ترجمان
برقی رسالہ

تحقیقاتِ اسلامی

جلد (۱۴) ربیع الاول وربیع الثانی ۱۴۴۸ھ مطابق: ستمبر ۲۰۲۶ء شمارہ (۳)

زیر سرپرستی
حضرت مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی
بانی ومہتمم جامعۃ السعادۃ کیرانہ وصدر انجمن دعوت الی الحق

مرتّب
محمد صغیر قاسمی
09897855010
sagheerqasmi@gmail.com

ترسیل کے لیے رابطہ کریں: محمد معظم رحمانی قاسمی 09359602830
موبائل نمبر: 09359602830 ای میل: tahqiqateislami2011@gmail.com

ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط وکتابت کا پتہ:
دفتر ماہنامہ "تحقیقاتِ اسلامی"
جامعۃ السعادۃ
محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ کیرانہ ضلع شاملی (یوپی) انڈیا

Add: Office Tahqiqat-e-Islami
Jamiatus Sa'adah, Moh.Ibrahimpura
(Aal Kalan) Shamli Road, Kairana
Distt. Shamli (U.P.) India
A/c No. 3023002100004803
TAHQIQAT-E-ISLAMI
Punjab National Bank, Branch: Kairana

ناشر
تحقیقاتِ اسلامی
۲۴۱/آل خورد (ملتانیان) کیرانہ ضلع شاملی (یو۔پی) ۲۴۷۷۷۴



آئینہ

صریر خامہ

مادہ پرستی کا فتنہ	محمد صغیر قاسمی پرتاپ گڑھی	(۳)

درس قرآن

تفسیر سُوْرَۃُ الْحَاقَّۃ	مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی	(۶)

مقالات ومضامین:

آدابِ تعلیم وتعلم	مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی	(۱۲)
پتھر ہی ٹوٹ جائے.....	مولانا محمد ناصر ندوی پرتاپ گڑھی	(۱۷)
تہذیب کی عریانیت	مولانا محمد مسعود عالم قاسمی	(۲۲)
جدید سائنس اور عدت	مولانا انیس الرحمن ندوی	(۲۶)
نئی نسل کدھر جارہی ہے؟	مولانا سید احمد ومیض ندوی	(۲۹)
فضول خرچی کی حقیقت	مولوی محمد عادل اریاوی	(۳۳)

یادرفتگاں

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی	ابوطہ محمد صغیر پرتاپ گڑھی	(۳۹)
فقہ وفتاوی	مفتی محمد ریحان گودھروی	(۴۳)

افسانہ

قصہ چہار درویش	میر امن دہلوی	(۴۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صریر خامہ

مادہ پرستی کا فتنہ

محمد صغیر پرتاپ گڑھی

انسانی زندگی اسباب کے حصار میں بسر ہوتی ہے۔ حصولِ رزق کے لیے محنت، بیماری کے لیے علاج، حفاظت کے لیے تدبیر اور زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے لیے مختلف وسائل کا اختیار کرنا، انسانی فطرت کا بھی تقاضا ہے اور نظامِ کائنات کا بھی۔ اسلام نے نہ کبھی اسباب سے گریز کی تعلیم دی ہے اور نہ انسان کو ترکِ عمل اور بے تدبیری کا درس دیا ہے؛ بلکہ اس نے زندگی کے تمام معاملات میں مناسب اسباب اختیار کرنے کے ساتھ یہ بنیادی حقیقت ذہن نشین کرائی ہے کہ اسباب اپنی ذات میں خودمختار نہیں، ان کی تاثیر مستقل نہیں اور کائنات میں مؤثرِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس سے اسلامی تصورِ حیات اور مادہ پرستانہ فکر کے درمیان بنیادی فرق نمایاں ہوتا ہے۔

مسلمان دوا بھی استعمال کرتا ہے اور شفا کا یقین بھی اللہ تعالیٰ سے وابستہ رکھتا ہے؛ وہ رزق کے لیے جدوجہد بھی کرتا ہے، مگر رزق کا مالک اپنے وسائل کو نہیں، اللہ تعالیٰ کو سمجھتا ہے؛ وہ تدبیر اور منصوبہ بندی سے بھی کام لیتا ہے، لیکن نتائج کو اپنی تدبیر کا لازمی حاصل نہیں سمجھتا۔ اسباب اختیار کرنا اس کی عملی زندگی کا حصہ ہے، مگر اسباب پر اعتماد اس کے ایمان کی بنیاد نہیں۔ اس کا ہاتھ اسباب سے وابستہ رہتا ہے اور اس کا دل مسبب الاسباب سے۔

عصرِ حاضر میں اسی توازن کے بگڑ جانے نے ایک نئے فکری فتنے کو جنم دیا ہے۔ جدید انسان نے سائنس، ٹیکنالوجی اور مادی وسائل کے میدان میں جو غیر معمولی ترقی حاصل کی ہے، اس نے اسے کائنات کے بہت سے اسرار سے آگاہ کیا، زندگی کی بے شمار دشواریاں آسان کیں اور انسانی طاقت و استطاعت کے دائرے کو وسیع کیا؛ لیکن اسی ترقی کے نشے نے انسان کے اندر یہ احساس بھی پیدا کر دیا کہ وہ اپنی عقل، علم اور وسائل کے بل پر ہر مسئلے کا حل تلاش کر سکتا ہے اور زندگی کے تمام معاملات کو اپنی تدبیر کے ذریعے اپنے قبضۂ اختیار میں لا سکتا ہے۔ یہاں سے مادہ پرستی کا وہ ذہنی سفر شروع ہوتا ہے جس میں انسان اسباب کو محض ذریعہ سمجھنے کے بجائے اصل طاقت تصور کرنے لگتا ہے۔

یہ مادہ پرستی صرف دولت کی محبت یا آسائشوں کی رغبت کا نام نہیں، بلکہ ایک ایسا طرزِ فکر ہے جس میں زندگی کی حقیقت کو مادی پیمانوں تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ کامیابی دولت سے، عزت منصب سے، طاقت وسائل سے اور علم صرف تجربہ و مشاہدہ سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ جو چیز محسوس نہ کی جا سکے، جسے مادی پیمانوں سے ناپا نہ جا سکے، یا جس کا فوری دنیاوی

فائدہ سامنے نہ آئے، اس کی اہمیت انسانی شعور میں کم ہونے لگتی ہے۔ اس ذہنیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان ظاہری اسباب کے پیچھے کارفرما قدرتِ الٰہی سے غافل ہونے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کی نگاہ میں مادہ ہی زندگی کی اصل حقیقت بن جاتا ہے۔

یہی فکری بیماری آج خصوصیت کے ساتھ نئی نسل کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔ جدید تعلیم اور عصری مہارتوں کی افادیت سے انکار ممکن نہیں، بلکہ امت کے لیے ان میدانوں میں آگے بڑھنا ناگزیر ہے؛ لیکن جب تعلیم کا پورا نظام انسان کو صرف دنیا میں کامیاب بنانے کے لیے تیار کرے اور اس کے ذہن میں زندگی کے مقصد، خالقِ کائنات کی معرفت اور انسانی ذمہ داری کا شعور پیدا نہ کرے تو علم، حکمت سے جدا ہو جاتا ہے۔ عقل کو معلومات تو ملتی ہیں، مگر سمت نہیں ملتی؛ صلاحیت پیدا ہوتی ہے، مگر اس کے استعمال کی اخلاقی بنیاد کمزور رہ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مادّی ترقی کے باوجود انسانی معاشرہ اخلاقی اضطراب کا شکار ہے۔ معلومات میں اضافہ ہوا ہے، مگر حکمت میں نہیں؛ وسائل بڑھے ہیں، مگر سکون کم ہوا ہے؛ سہولتیں پیدا ہوئی ہیں، مگر دلوں کا اطمینان باقی نہیں رہا۔ انسان نے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرنے میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں، مگر اپنی خواہشات اور اپنے نفس پر قابو پانے میں وہ پہلے سے زیادہ کمزور دکھائی دیتا ہے۔ اسباب کی فراوانی نے اسے آسودہ تو کیا، مگر بے نیاز نہیں؛ بلکہ بسا اوقات اس کی بے چینی کو اور بڑھا دیا، کیونکہ جس انسان کا اعتماد صرف ظاہری وسائل پر ہو، اس کے وسائل میں معمولی سی تبدیلی بھی اس کے اطمینان کو متزلزل کر دیتی ہے۔

اسلام کا تصورِ توحید انسان کو اسی اضطراب سے نجات دیتا ہے۔ وہ اسے اسباب کی دنیا سے کاٹتا نہیں، بلکہ اسباب کی صحیح حیثیت متعین کرتا ہے۔ وہ انسان کو محنت سے نہیں روکتا، بلکہ محنت کو عبادت کا رنگ دیتا ہے؛ وہ علاج سے منع نہیں کرتا، بلکہ علاج کے ساتھ شفا دینے والی ذات پر یقین پیدا کرتا ہے؛ وہ تدبیر کی نفی نہیں کرتا، بلکہ تدبیر کو تقدیر کے مقابلے میں خود مختار نہیں سمجھنے دیتا۔ یہی اعتدال اسلامی زندگی کی اصل روح ہے اور اسی کے فقدان سے اسباب پرستی جنم لیتی ہے۔

اسباب پرستی کا خطرہ صرف اعتقادی دائرے تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کے اثرات انسانی اخلاق اور اجتماعی زندگی پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ جب مادی کامیابی، زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن جائے، تو اخلاقی اقدار رفتہ رفتہ مفاد کے تابع ہونے لگتی ہیں۔ دیانت، اخلاص، حیا، ایثار اور عدل کی قدر اس وقت تک باقی رہتی ہے، جب تک انسان کے سامنے کوئی ایسی حقیقت موجود ہو، جو مادی منفعت سے بلند ہو۔ لیکن جب زندگی کی تمام ترجیحات کا مرکز صرف حصول اور استفادہ بن جائے، تو جائز و ناجائز کی سرحدیں دھندلی ہونے لگتی ہیں اور انسان ہر اس راستے کو اختیار کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے جو اسے زیادہ فائدہ پہنچا سکے۔

اس لیے عصرِ حاضر کے اس فتنے کا علاج ترقی سے گریز یا جدید علوم سے بے اعتنائی نہیں، بلکہ ایک صحیح اسلامی

توازن کی بازیافت ہے۔ ہماری نئی نسل کو سائنس بھی درکار ہے اور ایمان بھی، تحقیق بھی اور بصیرت بھی، دنیا کے اسباب کا علم بھی اور مسبب الاسباب کی معرفت بھی۔ اسے یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ انسان کی عقل اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اس کا علم محدود ہے، اس کی قوت عارضی ہے اور اس کے تمام وسائل ایک اعلیٰ تر قدرت رب ذوالجلال کے تابع ہیں۔ اس شعور کے بغیر مادی ترقی انسان کو سہولتیں تو دے سکتی ہے، زندگی کا صحیح مقصد نہیں دے سکتی۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تعلیمی، فکری اور تربیتی ترجیحات پر سنجیدگی سے غور کریں اور نئی نسل کے اندر عقیدۂ توحید کو محض ایک درسی موضوع کے طور پر نہیں، بلکہ زندگی کی عملی حقیقت کے طور پر راسخ کریں۔ اسے اسباب کے استعمال کی صلاحیت بھی حاصل ہو اور اسباب کی حقیقت کا شعور بھی؛ وہ دنیا میں آگے بڑھے، مگر دنیا کو اپنی آخری منزل نہ سمجھے؛ وہ وسائل پیدا کرے، مگر وسائل کا غلام نہ بنے؛ وہ اپنی عقل سے کام لے، مگر اپنی عقل کی محدودیت کو بھی پہچانے۔

دورِ جدید کا اصل چیلنج شاید یہی ہے کہ انسان، اسباب کی حیرت انگیز دنیا میں رہتے ہوئے، اس حقیقت کو فراموش نہ کرے کہ سبب کے پیچھے ایک مسبب ہے، نظام کے پیچھے ایک ناظم ہے اور تمام قوتوں کے اوپر ایک ایسی قدرت ہے، جس کے اذن کے بغیر کوئی سبب مؤثر نہیں ہوسکتا۔ اسلامی فکر کی یہی اساس انسان کو مادہ پرستی کے فتنہ سے محفوظ رکھتی ہے اور اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ دنیا کے تمام وسائل سے فائدہ اٹھائے، مگر اپنے دل اور اپنے اعتماد کو صرف اللہ رب العزت کے ساتھ وابستہ رکھے۔

یاد رہے اللہ عزوجل جس طرح کائنات اور کائنات کی چھوٹی بڑی تمام چیزوں کا خالق ہے، اسی طرح پوری کائنات کا نظام بھی اسی کے کنٹرول میں ہے اور پوری کائنات کا نظام وہی چلا بھی رہا ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، بغیر اس کی اجازت وحکم کے کوئی پرندہ کہیں پر نہیں مار سکتا، نہ ہی کوئی پتہ درخت سے ٹوٹ کر گر سکتا ہے، اور نہ کوئی دوا کسی بیمار کو شفا دے سکتی ہے، مدبر الامور اور مسبب الاسباب وہی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ یہی اسلامی عقیدہ اور نظریہ ہے اور ہر مومن پر لازم ہے کہ وہ اسباب تو اختیار کرے، لیکن اس کی نظر ذات مسبب الاسباب، خدائے وحدہ لاشریک پر ہو کہ وہ چاہے گا تو اس سبب میں تاثیر پیدا ہوگی، ورنہ نہیں۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے)

درس قرآن کریم

سُوْرَةُ الْحَاقَّة

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَأَمَّا مَنْ أُوتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ أُوْتَ كِتٰبِیَهْ ۝ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ۝ یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ۝ مَآ أَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ۝ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا ۝ فَاسْلُكُوْهُ ۝ إِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ۝ فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ ۝ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ ۝ لَّا یَأْكُلُهٗ إِلَّا الْخٰطِئُوْنَ ۝

ترجمہ:

اور جس کو ملا اس کا لکھا بائیں ہاتھ میں وہ کہتا ہے کیا اچھا ہوتا جو مجھ کو نہ ملتا میرا لکھا۔ اور مجھ کو خبر نہ ہوتی کہ کیا ہے حساب میرا۔ کسی طرح وہی موت ختم کر جاتی۔ کچھ کام نہ آیا مجھ کو میرا مال۔ برباد ہوئی مجھ سے حکومت میری۔ اس کو پکڑو پھر طوق ڈالو۔ پھر آگ کے ڈھیر میں اس کو ڈالو۔ پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر گز ہے اس کو جکڑ دو۔ وہ تھا کہ یقین نہ لاتا تھا اللہ پر جو سب سے بڑا۔ اور تاکید نہ کرتا تھا فقیر کے کھانے پر۔ سو کوئی نہیں آج اس کا یہاں دوستدار۔ اور نہ کچھ ملے کھانا مگر زخموں کا دھوون۔ کوئی نہ کھائے اس کو مگر وہی گنہگار۔

تشریح وتفسیر

"وَأَمَّا مَنْ أُوتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ أُوْتَ كِتٰبِیَهْ۔ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ" (اور جس کو ملا اس کا لکھا بائیں ہاتھ میں وہ کہتا ہے کیا اچھا ہوتا جو مجھ کو نہ ملتا میرا لکھا۔ اور مجھ کو خبر نہ ہوتی کہ کیا ہے حساب میرا۔) اس سے پہلے ان لوگوں کا حال بیان ہوا ہے، جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ اب ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جن کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ سورۃ انشقاق میں فرمایا گیا ہے "کہ بعض لوگوں کے اعمال نامے ان کی پشت کے پیچھے سے پکڑائے جائیں گے۔" دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی مجرم کو اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے نامۂ اعمال میں کیا ہے۔ تو وہ بددلی سے نامۂ عمل پکڑ تو لے گا لیکن اسے پیٹھ پیچھے چھپا لے گا، تاکہ لوگ اسے دیکھ نہ پائیں۔ کیونکہ قیامت کے دن جس شخص کے

بھی بائیں ہاتھ میں نامۂ عمل ہوگا دیکھنے والے جان لیں گے کہ یہ شخص اپنے جرائم کی پاداش میں پکڑا گیا ہے اور یہ ایک برا شخص تھا، اسی وجہ سے اسے بائیں ہاتھ میں نامۂ عمل دیا گیا ہے۔ تو وہ اپنا اعمال نامہ دیکھتے ہی اپنا سر پیٹ لے گا اور واویلا کرتے ہوئے کہے گا، کاش مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا گیا ہوتا اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ بے خبری بھی آدمی کو کسی حد تک تسکین دیتی ہے اور ممکن ہے اس کا یہ مطلب ہو کہ اگر مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا تو لوگوں کے سامنے میری رسوائی نہ ہوتی اور مجھے بھی خبر نہ ہوتی کہ میں کس قدر جرائم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ (روح القرآن)

صاحب تفسیر مظہری لکھتے ہیں کہ یہاں ''مَنْ'' سے مراد کافر ہے، کافر کا بایاں ہاتھ پشت کے پیچھے کر کے اس میں اعمالنامہ دیا جائے گا (**کذا اخرج البیھقی عن مجاھد**) ابن سائب نے کہا بائیں ہاتھ کو موڑ کر پشت کے پیچھے کر کے اعمالنامہ دیا جائے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کافر کا بایاں ہاتھ سینہ کے اندر سے کھینچ کر پشت کے پیچھے کر دیا جائے گا۔ تو وہ اپنے اعمالِ بد اور ان کا برا انجام دیکھ کر کہے، اے کاش میرا اعمالنامہ نہ دیا جاتا اور مجھے خبر ہی نہ ہوتی کہ کیا ہے میرا حساب۔ (مظہری)

''یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ'' (کسی طرح وہی موت ختم کر جاتی) یعنی اپنے انجام کی ہولناکی کا تصور کرتے ہوئے وہ کہے گا کہ کاش جو موت مجھے آئی تھی وہ فیصلہ کن ہوگئی ہوتی۔ یعنی یہ دوبارہ زندگی ہمیں نہ دی جاتی اور نہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا۔ (روح القرآن) حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: دنیا میں اس کے لیے ناگوار ترین چیز موت تھی مگر قیامت کے دن وہ موت کی تمنا کرے گا۔ اعمال نامہ نہ ملنے اور حساب نہ جاننے کی تمنا سے در پردہ مراد ہے دوبارہ زندہ نہ ہونا اور ''یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ'' میں صراحت کے ساتھ عدم بعث کی تمنا ہے۔ اس لیے دونوں جملوں کا مضمون ایک ہی ہوا (ہاں اوّل در پردہ اظہار ہے اور دوسرا صراحۃً) اور دوسرا جملہ اوّل جملہ کی تاکید ہو گیا، اسی وجہ سے حرف عطف کو ذکر نہیں کیا گیا۔ (مظہری)

''مَاۤ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ'' (کچھ کام نہ آیا مجھ کو میرا مال) ''مَاۤ اَغْنٰی'' ''مَاۤ'' نفی کے لیے ہے یا استفہام انکاری کے لیے: میرے لیے کارآمد نہیں ہوا، کیا مجھے کچھ مفید ہوا۔ ''مَالِیَهْ'' وہ جو میرا تھا یعنی مال، اولاد، خدام۔ (ظہری) یعنی ہر مجرم نہایت حسرت سے کہے گا کہ جس مال کو میں نے نہایت اہتمام سے جمع کیا اور گن گن کر رکھا اور میرا گمان یہ تھا کہ مال کی قوت سے ہر کام کرایا جا سکتا اور ہر شخص کو خریدا جا سکتا ہے، لیکن آج وہ میرا مال بھی میرے کسی کام نہ آیا۔

''هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ'' (برباد ہوئی مجھ سے حکومت میری) اور پھر (مزید یہ بھی کہے گا کہ) مجھے اپنے اقتدار پر کس قدر بھروسہ تھا، میں کسی کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہ تھا، میں اپنے لشکر کی قوت کو فیصلہ کن سمجھتا تھا اور اسی اقتدار کے بل بوتے پر اکڑتا پھرتا اور ظلم توڑتا تھا لیکن آج وہ سب کچھ مجھ سے چھن گیا۔ آج صرف اس کا اقتدار ہے جو ہمیں دنیا میں کبھی نظر نہ آیا۔ ہمیں بتانے والے بتاتے رہے کہ اصل مقتدر ذات اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ دنیا میں اس نے اصحابِ اقتدار کو ایک

محدود اختیار دے کر آزمائش میں مبتلا کیا اور انہیں اپنے اقتدار و اختیار کا تابع بنایا کہ اگر وہ اپنی حدود سے تجاوز کریں گے تو قیامت کے دن ان سے سخت باز پرس ہوگی لیکن میں نے ان باتوں کو کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ ادھر مسلسل آواز آرہی ہوگی ''لِمَنِ الْمُلْکُ اَلْیَوْمَ'' (بتاؤ آج کس کی حکومت ہے۔) اور یہ سر جھکائے ندامت سے سوچ رہا ہوگا کہ کاش مجھے یہ ندا دنیا میں سنائی دے جاتی۔ (روح القرآن)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''سلطان'' کے لفظی معنی غلبہ و تسلط کے ہیں، اسی لئے حکومت کو سلطنت اور حاکم کو سلطان کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو مجھے دوسرے لوگوں پر بڑائی اور غلبہ حاصل تھا میں سب میں بڑا مانا جاتا تھا آج وہ بڑائی اور غلبہ بھی کچھ کام نہ آیا اور سلطان بمعنی حجت بھی لیا جا سکتا ہے تو معنے یہ ہوں گے کہ افسوس آج میرے ہاتھ میں کوئی حجت و سند نہیں جس کے ذریعہ عذاب سے نجات حاصل ہو سکے۔ (معارف)

''خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ'' (اس کو پکڑو پھر طوق ڈالو) یہ حکم فرشتوں کو ہوگا کہ اس مجرم کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق ڈالو، لیکن الفاظ آیت میں اس کا ذکر نہیں کہ کون پکڑے اور طوق ڈالے، اسی لئے بعض روایات میں ہے کہ یہ حکم صادر ہوگا تو ہر در و دیوار اور ہر چیز مطیع و فرمانبردار نوکروں کی طرح اس کے پکڑنے کو دوڑے گی۔ (معارف) مطلب یہ ہے کہ مجرموں کا رونا دھونا اور نالۂ و شیون جاری ہوگا کہ (اسی وقت) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آئے گا کہ ان مجرموں میں سے ایک ایک کو پکڑو، یہ اب کسی رعایت کے مستحق نہیں، ان میں سے ہر ایک کی گردن میں طوق ڈال دو۔ (روح القرآن) یا یہ مراد ہے کہ اس کے ہاتھ اس کی گردن میں باندھ دو۔ (حقانی)

''ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ'' (پھر آگ کے ڈھیر میں اس کو ڈالو) یعنی پھر حکم ہوگا اس کو دہکتی آگ میں ڈال دو، یعنی باندھ کر ڈالو کہ ہاتھ پاؤں نہ مار سکے۔ (تفسیر حقانی) ''اَلْجَحِیْمَ'' (مفعول) کو فعل سے پہلے لانا مفید حصر ہے، اس کے معنی ہیں بڑی (دہکتی) آگ۔ اس جگہ اور اس کے بعد لفظ ''ثُمَّ'' سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہر آئندہ مصیبت پچھلی مصیبت سے بہت زیادہ سخت ہوگی (اوّل گرفتاری، اس کے بعد گردن سے ہاتھوں کی بندش ہوگی، اس کے بعد جہنم میں داخلہ بہت سخت ہوگا، اس کے بعد ایک زنجیر میں پرو دیا جانا اور بھی شدید ہوگا۔ (روح القرآن)

''ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُکُوْهُ'' (پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر گز ہے اس کو جکڑ دو۔) ''سَلَکَ'' کا ترجمہ محاورے میں عموماً جکڑنا کر دیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا ترجمہ پرونا ہوتا ہے، جس طرح موتی یا تسبیح کے دانے پروئے جاتے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے مفہوم یہ ہوگا کہ زنجیر ان کے جسموں کے اندر سے گزارو اور پھر اس طرح سے انہیں جکڑو۔ جسم کے اندر سے زنجیر کے نکالنے کی تائید بعض روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ سورۃ ہمزہ سے یہ تأثر ملتا ہے کہ جو لوگ دولت گن گن کر جمع کرتے ہیں اور دولت کے سانپ بن کر رہتے ہیں (یعنی زکوۃ وغیرہ نہیں ادا کرتے)

ایسے سرمایہ داروں کو دوزخ میں بھاری زنجیروں میں ستونوں کے ساتھ باندھ دیا جائے گا تا کہ جس دولت پر مارِ گنج بن کر بیٹھے رہے اس کی تپش کا مزہ اچھی طرح چکھیں۔ (روح القرآن)

ابن ابی حاتمؒ اور بیہقیؒ نے عوفیؒ کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ زنجیر کافر کے مقعد سے داخل کر کے، ناک کے نتھنوں میں سے نکالی جائے گی (اس طرح اس کو زنجیر میں پرو دیا جائے گا) تا کہ وہ پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ ابن ابی حاتم نے ابن جریر کے طریقہ سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ زنجیر سرین سے داخل کی جائے گی اور منہ سے نکالی جائے گی اور جس طرح ٹڈی کو لکڑی میں پروتے ہیں، اسی طرح زنجیر میں کافر کو پرو دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کو بھونا جائے گا۔ نوف بکائی شامی کا قول ہے: زنجیر ستّر ذراع کی ہوگی اور ہر ذراع ستّر بانہہ کا اور ہر بانہہ اتنی لمبی جتنی یہاں سے مکہ تک کی مسافت ہے، اس بات کے وقت بکائی کوفہ کے میدان میں تھے۔ ہنادؒ اور ابن مبارکؒ کا بیان ہے کہ سفیان نے فرمایا ہر ذراع، ستّر ذراع کا ہوگا۔ حسن بصریؒ نے فرمایا: اللہ جانے کونسا ذراع ہوگا۔

میں کہتا ہوں (صاحب تفسیر مظہری) شاید دوزخ کے دربان فرشتوں کے ذراع مراد ہو، یا جہنم کے اندر کافر کا ذراع اتنا بڑا ہو جائے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ دوزخ کے اندر کافر کی داڑھ کوہ احد کی برابر اور اس کی کھال کی موٹائی تین روز کی راہ کے بقدر ہوگی۔ (رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ مرفوعاً) احمد، ترمذی اور بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت بیان کی ہے اور ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سر کی کھوپڑی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اس (زنجیر) کا اتنا گولا اگر آسمان سے چھوڑا جائے، تو رات ہونے سے پہلے زمین پر پہنچ جائے گا، باوجودیکہ آسمان و زمین کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت ہے، لیکن اگر وہ گولا زنجیر کے ایک سرے سے دوزخ میں لٹکایا جائے گا تو شبانہ روز چل کر چالیس برس میں دوزخ کی تہہ یا قعر تک پہنچے گا۔ ابن مبارکؒ نے کعبؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس زنجیر کی ایک کڑی دنیا کے سارے لوہے کے برابر ہوگی۔ ابونعیم نے محمد بن منکدر کا قول نقل کیا ہے کہ اگر دنیا کا تمام گزشتہ اور آئندہ لوہا جمع کیا جائے تو جہنم کی زنجیر کی ایک کڑی کے برابر نہیں ہوگا۔ (از مظہری)

لمبی زنجیر اشارہ ہے اس کے حرص و ہوا و طول امل دنیا کی طرف، کہ بڑی بڑی لمبی زنجیروں میں دنیا کی بندھا ہوا تھا، جن کا اس کے خیال میں کہیں سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تھا۔ یوں ہوگا اور یوں ہوگا۔ اس میں خدا تعالیٰ سے غافل رہا کہ موت آ گئی۔ جس کو وہاں کی زنجیر سے بچنا ہو یہاں کی زنجیر سے نکلے۔ شہوات و لذات کی لمبی زنجیریں اس کو جکڑے ہوئے ہیں اور طوق بھی گلے میں بدکاری اور اخلاق رذیلہ کے پڑے ہوئے ہیں اور شہوت و حرص کی دہکتی آگ میں ایسی زنجیروں میں جکڑا ہوا پڑا ہے۔ مردان خدا ہی ان بیڑیوں اور اس آگ سے نکل بھاگے ہیں، دنیا کے کاروبار کرتے ہیں، بیاہ شادی کرتے ہیں، مگر دل نہیں لگاتے۔ لیکن بقدر ضرورت۔ پھر آگے ان جہنمیوں کا اصل جرم بیان فرماتا ہے کہ جس کے سبب وہ آج اس جرم میں گرفتار ہوئے۔ (حقانی)

"إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ" (وہ تھا کہ یقین نہ لاتا تھا اللہ پر جو سب سے بڑا) عذاب مذکور کی علت کا بیان ہے۔ لفظ "عظیم" کے ذکر سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ ہی مستحق عظمت ہے، اگر اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو مستحق عظمت قرار دے گا تو وہ عذاب کا مستحق ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بزرگی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار (یعنی میں بزرگی اور بڑائی کے پردوں میں پوشیدہ ہوں) اب جو شخص میرا کوئی لباس مجھ سے کھینچے گا میں اس کو آگ میں داخل کروں گا۔ (رواہ مسلم) (مظہری)

اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں مذکوہ لوگوں کے بنیادی جرائم بیان کئے جارہے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو اتنی سخت سزا دی جائے گی:

چنانچہ ارشاد ہے کہ ان کو اتنی سخت سزا اس لیے دی جائے گی کہ: ان میں کا ہر شخص نہ تو خدائے بزرگ و برتر پر ایمان رکھتا تھا۔ ایمان کا ایک معنی تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ویسے نہیں مانتا تھا جیسے ماننا چاہیے۔ اس کی ذات اور اس کی صفات میں شریک ٹھہراتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے رسول کو ماننے اور آخرت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا۔ اس سے پہلے کی آیت میں چونکہ خاص طور پر مال کا ذکر آیا ہے، تو اس سیاق میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے مال کو اپنی ذاتی کوششوں کا نتیجہ اور اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ اور دوسرا جرم اس کا یہ تھا:

"وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ" (اور تاکید نہ کرتا تھا فقیر کے کھانے پر) کہ جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتا تھا اور اس کی حدود کو پامال کرتا تھا، اسی طرح وہ بندوں کے حقوق سے بھی نا آشنا تھا اور مال و دولت کے بارے میں اس کے تصور نے اسے بندوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے محروم کر دیا تھا اور دولت سے بے پناہ عشق کی وجہ سے بخل کا ایسا شکار ہوا تھا کہ فقراء اور مساکین کو دھکے دیتا اور کسی غریب کی غربت اس کے دل میں رحم کے جذبات پیدا نہ کرسکتی تھی۔ اور اس کے بخل نے اسے انسانیت سے اتنا بیگانہ کر دیا تھا کہ نہ وہ خود کسی کی مدد کرتا اور نہ کسی کو ترغیب دیتا کہ وہ کسی مسکین کو کھانا کھلائے۔ کھانا کھلانا چونکہ ضروریاتِ زندگی میں سب سے پہلی ضرورت ہے اور نسبتاً آسان بھی۔ اس لیے اس کا ذکر فرمایا۔ ورنہ مقصود صرف کھانا کھلانا نہیں بلکہ فقراء کی ہر طرح کی مدد اس سے مراد ہے۔ نہ وہ خود کسی غریب کی مدد کرتا تھا اور نہ کسی کو اس کی ترغیب دیتا تھا۔ بخیل لوگوں کا عام حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں بھی یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ حاجت مندوں کی مدد کریں تاکہ ان کے بخل پر پردہ پڑا رہے۔ (روح القرآن) یہ بھی ممکن ہے کہ برانگیختہ کرنے کا تذکرہ کرکے یہ بات بتانی مقصود ہو کہ برانگیختہ نہ کرنے (اور ترغیب نہ دینے والے) کا جب یہ بُرا درجہ ہوگا تو خود نہ کرنے (اور مسکین کو نہ دینے والے) کا کیا درجہ ہوگا۔ (مظہری)

عملی کاموں میں عبادت کے بعد نفع خلائق اعلیٰ درجہ کی نیکوکاری ہے۔ پھر یہ بدبخت خدائے بزرگ پر تو ایمان ہی نہیں رکھتا تھا کہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کھانا کھلانے کا بدلہ دنیا اور آخرت میں خدا پاک دے گا، اس کی رضامندی ہمارے لیے کام

آئے گی۔ پھر آپ مسکین غریب کو روپیہ پیسہ دینا کپڑا پہنانا، راحت پہنچانا تو درکنار معمولی کھانا بھی نہیں دیتا تھا اور دینا تو درکنار اوروں کو بھی اس طرف رغبت نہیں دلاتا تھا بلکہ اس کام کو عبث اور فضول جانتا تھا۔ کبھی یہ حیلہ کرتا تھا کہ ہمارے پاس کچھ نہیں، کبھی یہ کہ ان کا ہمارے اوپر کیا حق ہے۔ اور ان لوگوں کو دینا بے ہمتی، بے غیرتی، گداگری سکھانا ہے۔ یہ گفتگو ان درماندوں کے حق میں کہ جو دراصل قابل ترحم ہیں محض بخل اور اندرونی خباثت پر مبنی ہے۔ ایسی تنگی اور مصیبت کے ٹالنے یا کم کرنے کے دو ہی سبب ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ تسلی دلاسا دینے والا اور چارہ گری کرنے والا ہو۔ دوم یہ کہ ایسی درماندگی کے وقت کھانا کھلایا جائے اور اسی لیے اہل مصیبت کے ساتھ تعزیت میں یہ دونوں باتیں برتی جاتی ہیں۔ تسلی دلاسا بھی دلایا جاتا ہے، کھانا بھی کھلایا جاتا ہے سو اس کے لیے یہ دونوں نہ ہوں گے۔ (حقانی)

"فَلَيْسَ لَهُ ٱلْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيمٌ" (سو کوئی نہیں آج اس کا یہاں دوستدار) ان جرائم کی سزا اس کو یہ بھی ملے گی کہ قیامت کے دن اس کا کوئی مخلص دوست اور کوئی ہمدرد و غمخوار نہیں ہوگا جو اسے عذاب سے بچا سکے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی دولت کا مصرف اپنی تن پروری، لذتِ کام و دہن یا دولت میں اضافے کے سوا کوئی اور نہیں سمجھتا تو ایسے شخص کا دنیا میں بھی کوئی ہمدرد و غمگسار نہیں ہوتا، آخرت میں کون ہوگا۔ (روح القرآن) سب سے بڑی حمایت کرنے والی اور مدد کرنے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس کی حمایت کا پرتو دوسرے حامیوں کے دلوں پر پڑتا ہے، جو حمایت پر کمر باندھتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ پر تو اس کا ایمان ہی نہ تھا، اس سے بگاڑ رکھی تھی اور نہ کھانا ہے اس لیے کہ دنیا میں یہ کسی کو نہیں کھلاتا تھا۔ (حقانی)

"وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ۔ لَّا يَأْكُلُهُ إِلَّا ٱلْخَٰطِئُونَ" (اور نہ کچھ ملے کھانا، مگر زخموں کا دھوون، کوئی نہ کھائے اس کو، مگر وہی گنہگار) چونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ کوئی بھلا نہیں کیا اور کسی کا حق نہ پہچانا اور کسی کو کبھی کھانا کھلانے کا روادار نہ ہوا تو قیامت کے دن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے کھانے اور پینے کے لیے زخمیوں کے زخموں کا دھوون اور ان کا خون اور پیپ دیا جائے گا۔ یوں تو اہل جہنم کو اور طرح کی غذائیں بھی دی جائیں گی، جن میں زقوم (تھوہڑ) کا بھی ذکر آیا ہے، لیکن زخموں کا غسالہ صرف ایسے خسیس لوگوں کی خوراک ہوگی جو دنیا میں کسی کو کھانا کھلانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ (روح القرآن) ابن ابن حاتم نے بطریق عکرمہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ "غسلین" دوزخیوں کا کچ لہو ہوگا۔ ضحاک اور ربیع کا قول ہے کہ "غسلین" ایک درخت ہوگا جس کو دوزخی کھائیں گے۔ ابن ابی حاتم نے بطریق مجاہد بیان کیا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا مجھے نہیں معلوم کہ "غسلین" کیا چیز ہوگی مگر میرا خیال ہے کہ "غسلین" ہی زقوم (تھوہڑ کا درخت) ہوگا۔ (مظہری)



مضامین ومقالات

آدابِ تعلیم وتعلم اورتربیتِ اساتذہ

قرآن وحدیث، اوراقوال سلف صالحین کی روشنی میں

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

تعلیم ایک مقدس ذمہ داری ہے۔ مدرسے میں استاد صرف کتاب نہیں پڑھاتا اور طالبِ علم صرف سبق یاد نہیں کرتا، بلکہ دونوں مل کر علم کی ایک امانت کو آگے منتقل کرتے ہیں۔ اس لیے اسلامی تعلیم کا نظام صرف نصاب، امتحان اور درجات تک محدود نہیں؛ اس کے ساتھ آداب، اخلاص، احترام، تواضع، ذمہ داری، تحقیق، عمل اور تربیت بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

علم کی پہلی بنیاد: نیت کی اصلاح۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ" اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔ (متفق علیہ) استاذ کی نیت صرف یہ نہ ہو کہ وہ اپنا وقت پورا کرے، تنخواہ حاصل کرے، یا نصاب مکمل کردے، بلکہ اس کی نیت یہ ہو کہ: میں اللہ کی رضا کے لیے دین کی تعلیم دے رہا ہوں اور ان بچوں کی اصلاح وتربیت میں اپنا حصہ ادا کر رہا ہوں۔ اسی طرح طالب علم کی نیت بھی شہرت، بحث میں غلبہ یا صرف امتحان میں کامیابی نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اللہ کی رضا، علمِ نافع اور عملِ صالح ہونی چاہیے۔

استاذ کے لیے بنیادی اصول: استاذ خود بھی طالبِ علم رہے۔ ایک بہترین استاذ وہ ہے جو یہ نہ سمجھے کہ اب اسے مزید سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی: ﴿وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ (اور کہیے: اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔) جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم میں اضافے کی دعا سکھائی گئی، تو ایک معلم کے لیے علم کے سفر کو کبھی ختم نہیں سمجھنا چاہیے۔ استاذ کی تعلیم رک جائے تو اس کی تدریس بھی رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگتی ہے۔ اس لیے ہر استاذ کو مطالعہ، سوال، تحقیق، تجربہ اور اپنی تدریسی صلاحیت بہتر بنانے کا مستقل معمول بنانا چاہیے۔

علم میں تواضع اختیار کرنا: علم کا حسن یہ ہے کہ انسان کو اپنے علم کے ساتھ اپنی لاعلمی کا بھی احساس ہو۔ استاذ کو اگر کسی سوال کا جواب معلوم نہ ہو تو یہ کہنا عیب نہیں: "مجھے اس وقت اس کا مکمل علم نہیں، میں تحقیق کر کے بتاؤں گا"۔ بلکہ بغیر تحقیق کے غلط جواب دینا زیادہ نقصان دہ ہے۔ یہی علمی دیانت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔ (النحل: ۴۳) یہ آیت ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ نہ جاننے کی صورت میں اہلِ علم سے رجوع کرنا علم کا حصہ ہے۔

طالب علم کے لیے ضروری اصول: استاذ کی تعظیم اور ادب واحترام: قرآن مجید میں ارشاد باری ہے: ﴿يَرْفَعِ

اللہ الَّذِینَ آمَنُوا مِنکُمْ وَالَّذِینَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ اللہ تم میں سے ایمان والوں اور علم دیے جانے والوں کے درجات بلند فرماتا ہے۔ (المجادلہ:۱۱)

استاد علم کا ذریعہ ہے، اس لیے طالب علم کو اس کے ساتھ ادب، احترام اور حسنِ سلوک کا معاملہ اختیار کرنا چاہیے۔ استاد کے سامنے شور کرنا، بات کاٹنا، اس کی عظمت کا خیال نہ رکھنا، اس کے ساتھ بے توجہی کا معاملہ کرنا، آنکھیں چڑھانا، طنز کرنا یا اس کی غیر موجودگی میں اس کی تحقیر کرنا علم کے ادب کے خلاف ہے۔

اکابر نے ادبِ علم کیسے سیکھا؟ اکابر کے یہاں علم کے ساتھ، ادب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسے بڑے عالمِ صحابی سے علم حاصل کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان سے منقول ہے کہ انہوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سواری کی رکاب تھامی۔ زید رضی اللہ عنہ نے منع کرنا چاہا مگر پھر بھی آپ نے مہار کو پکڑے رکھا۔ یہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے استاذ کے سامنے تواضع اختیار کی۔ یہ واقعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ: جتنا علم بڑھے، اتنی ہی تواضع بڑھنی چاہیے۔ اسی طرح ائمہ اور محدثین کے تذکروں میں ہمیں استاذ کے سامنے وقار، خاموشی، توجہ، سوال میں ادب اور علمی مجلس کی عظمت کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کی مجلسِ حدیث کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص اہتمام فرماتے، وضو کرتے، خوشبو لگاتے اور وقار کے ساتھ حدیث بیان کرتے تھے۔ یہ صرف ظاہری اہتمام نہیں تھا؛ اس کے پیچھے یہ احساس تھا کہ: ہم کس مقدس علم کو پڑھ رہے ہیں اور کس عظیم ہستی کی احادیث بیان کر رہے ہیں۔

سوال کا طریقہ: جب طالب علم استاذ کے سامنے کوئی بات عرض کرے یا سوال کرے تو ادب کے ساتھ کرے۔ اسلام سوال کرنے سے نہیں روکتا، بلکہ قرآن غور وفکر اور سوال کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن سوال کا بھی ادب ہے۔ طالب علم کو بات سمجھ میں نہ آئے تو چاہئے کہ استاذ سے دریافت کرلے۔ لیکن موقعہ محل دیکھ کر، اور خیال رکھتے ہوئے کہ آپ کی بات یا سوال کے انداز سے استاذ کو ناگواری نہ ہو، اسی طرح سوال کرتے وقت استاذ کی بات نہیں کاٹنی چاہیے۔ بحث برائے بحث سے بچنا چاہیے۔ اپنی علمی حیثیت سے زیادہ دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔ جواب ملنے کے بعد اسے سمجھنے اور تحقیق کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سوال علم کا دروازہ ہے، لیکن بے ادبی اس دروازے کو بند کرسکتی ہے۔

استاذ کی ذمہ داری: ہر بچے کو ایک جیسا نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ ہر بچے کو اس کی سمجھ بوجھ، علمی ذوق اور صلاحیت کے مطابق سمجھنا تدریب المعلمین کا ایک نہایت اہم اصول ہے۔ کیوں کہ تمام بچے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کسی کا حافظہ تیز ہوتا ہے، کسی کی سمجھ اچھی ہوتی ہے، کوئی آہستہ سیکھتا ہے، کوئی جلد بھول جاتا ہے، کوئی شرمیلا ہوتا ہے، کوئی بہت سوال کرتا ہے، اور کسی بچے کو گھر یا سابقہ تعلیمی ماحول کی وجہ سے اضافی مدد درکار ہوتی ہے۔ لہٰذا استاذ کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ: ''سب کو ایک ہی طریقے سے پڑھاؤں گا'' بلکہ اسے دیکھنا چاہیے کہ: ''کس طالب علم کو کس طریقے سے سمجھانے سے زیادہ فائدہ

ہوگا؟'' یہی حقیقی تدریسی مہارت ہے۔

کمزور طالب علم پر خصوصی توجہ دینا: کمزور طالب علم کو بوجھ نہیں، بلکہ ذمہ داری سمجھنا چاہئے، کلاس کا ذہین طالب علم اکثر استاذ کو آسان لگتا ہے، لیکن اصل استاذ کی صلاحیت وہاں ظاہر ہوتی ہے جہاں کوئی طالب علم کمزور ہو۔ کمزور طالب علم کو مسلسل نظر انداز کرنا، دوسروں سے موازنہ کرنا یا اسے ''نالائق'' قرار دے دینا تربیت نہیں ہے، بلکہ اپنی نااہلی ہے۔

استاد کو چاہیے کہ: اس کی کمزوری کی وجہ معلوم کرے۔ چھوٹے اہداف مقرر کرے۔ معمولی کامیابی پر بھی حوصلہ افزائی کرے۔ بار بار سمجھانے کی ضرورت پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔ اس کے اندر یہ احساس پیدا کرے کہ ''میں بھی سیکھ سکتا ہوں۔'' صرف غلطی نہ پکڑیں، صحیح عمل بھی دکھائیں۔ ایک استاد اگر پورا دن یہ کہتا رہے: ''یہ غلط ہے، یہ بھی غلط ہے، یہ بھی غلط ہے''۔ تو طالب علم آہستہ آہستہ خوف زدہ ہوجاتا ہے۔ اس کے بجائے استاد کو چاہیے کہ وہ کہے: ''یہ طریقہ درست نہیں، آیئے میں آپ کو درست طریقہ بتاتا ہوں۔'' تربیت کا بہترین انداز یہ ہے کہ غلطی کی اصلاح کے ساتھ صحیح متبادل بھی دیا جائے۔

تعریف بھی تربیت کا حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اچھی صفات کو سراہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مناسب اور سچی حوصلہ افزائی تربیت کا مؤثر ذریعہ ہے۔ استاذ کو صرف غلطی تلاش کرنے والا نگران نہیں بننا چاہیے۔ کبھی یہ بھی کہنا چاہیے: ''آج تم نے بہت اچھی کوشش کی۔'' ''آج تم پہلے سے بہتر تھے۔'' ''مجھے تم سے مزید بہتری کی امید ہے۔'' یہ چند الفاظ طالب علم کے اندر محنت کا جذبہ پیدا کرسکتے ہیں۔

طالب علم کی نفسیات سمجھنا: استاذ کو بچے کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اسی کے مطابق رہنمائی کرنی چاہئے۔ آج کے بچے پہلے کے بچوں سے مختلف ماحول میں پروان چڑھ رہے ہیں۔ موبائل، انٹرنیٹ، ویڈیوز، سوشل میڈیا، مسلسل بدلتی ہوئی معلومات اور گھر کے مختلف حالات ان کی توجہ اور ذہنی کیفیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے آج کے استاذ کے لیے صرف کتاب جاننا کافی نہیں۔ اسے اس پر بھی توجہ دینی چاہیے کہ: بچے کی توجہ کیسے حاصل کی جائے؟ اسے سبق میں کیسے شریک کیا جائے؟ کمزور بچے کی حوصلہ شکنی کیے بغیر اصلاح کیسے کی جائے؟ غصے کو قابو میں رکھ کر نظم کیسے قائم کیا جائے؟ موبائل اور جدید ذرائع کے منفی اثرات کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ یہ سب تدریب المعلمین کا حصہ ہونا چاہیے۔

غصہ پر قابو رکھنا: استاذ کے لیے غصے پر قابو رکھنا ضروری ہے۔ کلاس میں بعض اوقات ایک طالب علم بار بار غلطی کرے گا، کوئی بات نہیں مانے گا یا استاذ کو پریشان کرے گا۔ ایسے وقت میں استاذ کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ'' (متفق علیہ)

(طاقتور وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے، بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔)

لہٰذا استاذ کو غصے کے وقت فوری فیصلہ، سخت الفاظ، مار پیٹ اور بچے کی تحقیر کرنے سے بچنا چاہیے۔ جو استاذ اپنے غصے کو کنٹرول کرسکتا ہے، وہی دوسروں کی تربیت زیادہ مؤثر طریقے سے کرسکتا ہے۔ استاذ کی زبان، تربیت کا سب سے

طاقتور ذریعہ ہے، اس کے چند میٹھے بول اور اصلاحی بات طالب علم کی پوری زندگی پر اثر ڈال سکتے ہیں۔

اس لیے استاذ کو: گالی سے بچنا چاہیے۔ طنز سے بچنا چاہیے۔ کسی بچے کی شکل، خاندان یا کمزوری کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ ایک دوسرے کے سامنے ذلیل نہیں کرنا چاہیے۔ غصے میں ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں جنہیں بعد میں واپس لینا ممکن نہ ہو۔ اور سب سے بڑھ کر: استاذ کو بچوں کے سامنے اپنے ساتھی اساتذہ اور ادارے کی تحقیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ بچہ صرف الفاظ نہیں سنتا، وہ ادارے کے بارے میں اپنا ذہن بناتا ہے۔

اعتماد پیدا کرنا: استاذ اور طالب علم کے درمیان اعتماد کا رشتہ ہونا ضروری ہے، اچھا استاذ وہ ہے جس سے طالب علم خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اعتماد کی وجہ سے اپنی مشکل بیان کر سکے۔ اگر بچہ سبق نہیں سمجھا، گھر میں کوئی مسئلہ ہے، کسی ساتھی سے پریشان ہے، یا اپنی پڑھائی میں مشکل محسوس کر رہا ہے تو اسے یہ یقین ہونا چاہیے کہ: ''میرا استاذ میری بات سنے گا اور میری اصلاح کرے گا، میری تذلیل نہیں کرے گا۔'' یہ اعتماد تعلیمی ماحول کو مضبوط بناتا ہے۔

درس گاہ کا علمی وقار برقرار رکھنا:

استاذ اور طالب علم دونوں کو اپنی درس گاہ کا علمی وقار اور اس کے ادب کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ حدیث پاک میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللهِ تَعَالَى يَتْلُونَ كِتَابَ اللهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمْ السَّكِينَةُ وَغَشِيَتْهُمْ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمْ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمْ اللهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ'' (رواہ ابو داؤد)

(حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر قرآن پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان پر سکینہ نازل فرماتا ہے، اللہ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے پاس موجود فرشتوں سے ان کا ذکر فرماتا ہے)

درسگاہ صرف معلومات کی جگہ نہیں بلکہ سکون، وقار، ذکر، توجہ اور خیر کی جگہ ہونی چاہیے۔ استاذ کو کلاس میں ایسا ماحول بنانا چاہیے جہاں: طالب علم توجہ سے سنیں۔ سوال کر سکیں۔ غلطی سے سیکھیں۔ ایک دوسرے کا احترام کریں۔ علم کو بوجھ نہیں بلکہ نعمت سمجھیں۔

اساتذہ کی ٹریننگ: اساتذہ کی تربیت کا نظام صرف چند لیکچروں تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ عملی مشق بھی ہونی چاہئے۔ ایک مؤثر Teacher Training Programme میں درج ذیل چیزیں عملی طور پر شامل ہونی چاہئیں:

علمی تربیت: استاذ اپنے مضمون میں مضبوط ہو، حوالہ دینے کا طریقہ جانے اور غیر یقینی بات کو تحقیق کے بغیر بیان نہ کرے۔

تدریسی تربیت: سبق کی منصوبہ بندی، سوال و جواب، تکرار، مثال، مشق اور طالب علم کی سمجھ جانچنے کے طریقے

سیکھے۔

تربیتی تربیت: بچے کے کردار، عادات، نماز، صفائی، ادب اور ذمہ داری کی تربیت کا طریقہ سیکھے۔

نفسیاتی تربیت: مختلف مزاج اور صلاحیت رکھنے والے بچوں سے معاملہ کرنے کی بنیادی سمجھ حاصل کرے۔

انتظامی تربیت: حاضری، سبق، تاخیر، غیر حاضری، نظم وضبط اور طالب علم کے ریکارڈ کو مناسب طریقے سے برقرار رکھنا سیکھے۔

اخلاقی تربیت: غصہ، تعصب، تحقیر، غیر ضروری سختی اور ذاتی پسند وناپسند کو تدریس پر غالب نہ آنے دے۔

اور سب سے اہم یہ کہ اس بات پر نظر رہے کہ: کیا ہمارے طلبہ کے اخلاق، نماز کے اہتمام، صفائی، وقت کی پابندی اور تعلیمی معیار میں واقعی بہتری آرہی ہے؟ کیونکہ ادارے کی کامیابی صرف اس بات سے نہیں ناپی جانی چاہیے کہ استاذ نے کتنا پڑھایا، بلکہ اس بات سے بھی کہ طالب علم میں کتنا مثبت تغیر پیدا ہوا۔

مقصدِ علم: علم کا مقصد عمل ہے، علم اگر اخلاق وکردار میں ظاہر نہ ہو تو اس کی برکت کم ہوجاتی ہے۔ اس لیے استاد کو صرف یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ طالب علم نے سبق یاد کیا یا نہیں، بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے: کیا وہ نماز کا پابند ہورہا ہے؟ کیا اس کے اندر ادب پیدا ہورہا ہے؟ کیا وہ سچ بولنے کا اہتمام کررہا ہے؟ کیا وہ صفائی کا خیال رکھتا ہے؟ کیا وہ دوسروں کے حقوق سمجھ رہا ہے؟ کیا اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا ہورہا ہے؟ یہی باتیں تعلیم کو علمِ نافع بناتی ہیں۔

خلاصۂ کلام: خلاصہ یہ کہ مدرسے کا اصل سرمایہ صرف اس کی عمارت، کتابیں، نصاب یا امتحانی نتائج نہیں ہوتے۔ بلکہ مدرسے کا اصل سرمایہ اس کے اساتذہ اور ان کے ذریعے تیار ہونے والے طلبہ ہوتے ہیں۔ ایک استاد اگر اپنے علم کو اخلاص، اپنے علم کو ادب، اپنی تدریس کو حکمت، اپنی سختی کو اعتدال، اپنی زبان کو پاکیزگی اور اپنے منصب کو امانت سمجھ لے تو وہ صرف ایک کلاس نہیں بلکہ ایک نسل تیار کرسکتا ہے۔ اور طالب علم اگر یہ سمجھ لے کہ علم کے ساتھ ادب، استاذ کے ساتھ احترام، سوال کے ساتھ تواضع، مطالعے کے ساتھ عمل اور کامیابی کے ساتھ شکر ضروری ہے، تو اس کا علم اس کے لیے حقیقی نعمت بن جائے گا۔

ہمیں ایسے اساتذہ تیار کرنے ہیں جو صرف سبق پڑھانے والے نہ ہوں، بلکہ مربی ہوں؛ ایسے طلبہ تیار کرنے ہیں جو صرف امتحان پاس کرنے والے نہ ہوں، بلکہ باادب، باکردار، ذمہ دار اور علمِ نافع رکھنے والے مسلمان ہوں۔

اس لیے تدریب المعلمین کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے:

''استاذ کو صرف یہ نہ سکھایا جائے کہ بچے کو کیا پڑھانا ہے، بلکہ یہ بھی سکھایا جائے کہ بچے کو انسان کیسے بنانا ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہمارے اساتذہ کو اخلاص، علم، حکمت، صبر اور حسنِ تربیت عطا فرمائے، ہمارے طلبہ کو ادب وعلم سے آراستہ فرمائے اور ہمارے مدارس کو علم، عمل، اخلاق اور کردار سازی کے حقیقی مراکز بنائے۔ آمین۔

پتھر ہی ٹوٹ جائے، وہ شیشہ تلاش کر

مولانا محمد ناصر ندوی پرتاپ گڑھی

انسان کی زندگی میں کچھ مرحلے ایسے آتے ہیں، جب مسئلہ صرف یہ نہیں رہتا کہ راستہ کتنا دشوار ہے، اصل مسئلہ یہ بن جاتا ہے کہ انسان ان راستوں پر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا اس کے اندر نئے راستے تلاش کرنے کی صلاحیت بھی باقی ہے یا نہیں؟ جب ایک کے بعد ایک دیوار سامنے آتی جائے، جب طاقت کے پیمانے بدل جائیں، فیصلے یک طرفہ ہوجائیں، جب سچائی کی آواز شور میں دبنے لگے اور جب ناانصافی معمول کی صورت اختیار کرنے لگے، تو کمزور دل انسان کے لئے سب سے آسان کام مایوس ہوجانا ہے۔ ایسا انسان اپنے گرد کھڑی دیواروں کو دیکھتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ یقین کرنے لگتا ہے کہ یہی ہماری تقدیر ہے، شاید حالات بدلنے والے نہیں، اب امید کی کوئی کرن باقی نہیں ہے۔

لیکن تاریخ کا مزاج اس تصور سے مختلف ہے۔ تاریخ میں کوئی صورتِ حال ہمیشہ کے لیے منجمد نہیں رہتی۔ اقتدار بدلتے ہیں، نظریات اپنے انجام کو پہنچ کر زوال کے شکار ہوجاتے ہیں، معاشرے نئی کروٹ لیتے ہیں اور بظاہر ناقابلِ تسخیر دیواریں بھی وقت کے کسی موڑ پر راستہ بن جاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تاریخ کے بڑے فیصلے خود بخود وجود میں نہیں آتے، انسان کو کچھ ایسے افراد تیار کرنے پڑتے ہیں، جو ناممکن دکھائی دینے والے حالات میں بھی امکانات تلاش کرنے کا حوصلہ رکھ سکیں۔

اسی حقیقت کو شاعر نے اپنے اس شعر میں ایسی تحریک دے دی ہے کہ حوصلہ مند انسان ایک نئی قوت بن کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لائق ہوسکے:

ہر شیشہ ٹوٹ جاتا ہے پتھر کی چوٹ سے
پتھر ہی ٹوٹ جائے، وہ شیشہ تلاش کر

یہ پتھر صرف ایک رکاوٹ نہیں، وہ ہر وہ قوت ہے جو ہمیں بے بس سمجھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور شیشہ محض ایک کمزور شے نہیں، وہ اس غیر معمولی فکر، حکمت، کردار اور عزم کی علامت ہے جو سخت ترین حالات کے مقابل نئی راہ پیدا کرسکے۔

آج ہندوستانی معاشرہ بھی کئی پیچیدہ سوالات کے درمیان کھڑا ہے۔ سماجی فاصلے بڑھ رہے ہیں، باہمی اعتماد کو چیلنجز درپیش ہیں، مذہبی شناخت کے سوالات سیاسی کشمکش کا حصہ بنتے جارہے ہیں اور عوامی گفتگو میں دلیل کی جگہ جذبات کا

غلبہ بڑھتا محسوس ہوتا جارہا ہے۔ ایسے ماحول میں سب سے آسان راستہ یا تو خاموشی ہے یا اشتعال انگیزی، مگر دونوں کے درمیان ایک تیسرا راستہ بھی ہے۔ وہ ہے شعور، حکمت، قانون، کردار اور منظم جدوجہد کا راستہ۔

یہی وہ موڑ ہے جہاں ہمیں اپنے اجتماعی رویے کا جائزہ لینا ہوگا۔ نامساعد حالات اور مشکلات کا ذکر ضروری ہے، ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا بھی ضروری ہے، لیکن صرف شکایت کسی قوم کو آگے نہیں لے جاسکتی۔ جو قوم اپنے حالات کی تمام ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر اپنے حصے کی ذمہ داری سے سبک دوش ہوجائے، وہ اپنی قوتِ اصلاح کا ایک بڑا دروازہ خود بند کرلیتی ہے۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو مختلف سطحوں پر چیلنجز درپیش ہیں۔ سیاسی بے وزنی، معاشی کمزوری، تعلیمی پسماندگی، سماجی انتشار، باہمی اختلاف، فکری مرعوبیت اور نئی نسل کے سامنے پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل ہیں، یہ سب ایسی گتھیاں ہیں جنہیں محض جذباتی نعروں سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر مشکل کے اندر اصلاح کا ایک دروازہ موجود ہوتا ہے، بشرطیکہ ہم اسے پہچاننے اور تلاش کرنے کی صلاحیت پیدا کرلیں۔

اس پرآشوب دور میں سب سے پہلے ہمیں اپنے اندر یہ یقین پیدا کرنا ہوگا کہ کمزوری مستقل تقدیر نہیں۔ قومیں صرف اس وقت شکست نہیں کھاتیں جب ان کی سیاسی قوت کمزور ہوجائے، اصل شکست اس وقت ہوتی ہے جب ان کے اندر اپنی حالت بدلنے کا داعیہ ختم ہوجائے۔ اگر احساس زیاں باقی ہے، فکر زندہ ہے، علم کی جستجو موجود ہے، کردار میں استقامت ہے اور نئی نسل کو تیار کرنے کا شعور مرا نہیں ہے، تو امکانات کا دروازہ کبھی مکمل طور پر بند نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کا اصول بالکل واضح ہے:

"إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔"

(اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلیں،،

یہ آیت ہمیں ایک بنیادی اجتماعی ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔ تبدیلی کا انتظار کرنا آسان ہے، تبدیلی کے لیے خود کو تیار کرنا مشکل ہے، مگر تاریخ ہمیشہ اسی مشکل راستے گزر کر سے آگے بڑھتی ہے۔ ہمیں اپنی کمزوریوں کا دیانت دارانہ جائزہ لینا ہوگا۔ دوسروں کی غلطیوں کی فہرست بنانا آسان ہے، اپنے نقائص کا اعتراف کرنا مشکل ہے، لیکن تعمیر ہمیشہ خود احتسابی سے شروع ہوتی ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری نئی نسل کس ماحول میں پروان چڑھ رہی ہے۔ کیا ہم اسے صرف ماضی کی عظمت کی داستانیں سنا رہے ہیں یا مستقبل کی تعمیر کا ہنر بھی دے رہے ہیں، کیا ہم اسے صرف اپنے خلاف ہونے والی زیادتیوں کا احساس دلا کر بزدل اور ناکارہ بنا رہے ہیں یا اس کے ساتھ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ علم، کردار، صلاحیت اور قانون کے دائرے

میں جدوجہد کس طرح کی جاتی ہے، کیا ہمارے بچے صرف اپنے حقوق جانتے ہیں یا دوسروں کے حقوق کی پاس داری بھی سیکھ رہے ہیں؟

آج ہمیں ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو صرف ڈگری نہ دے بلکہ شخصیت بنائے، ایسی دینی تربیت کی ضرورت ہے جو ایمان کو زندگی کے اخلاقی اور عملی فیصلوں سے جوڑے رکھے، ایسی عصری تعلیم کی ضرورت ہے جو نوجوانوں کو دنیا کے بدلتے ہوئے میدانوں میں باوقار مقام حاصل کرنے کے قابل بنا سکے۔ ہمیں ایسے نوجوان درکار ہیں جو اپنے دین اور تہذیب سے وابستہ ہوں، مگر علمی تحقیق، سائنس، ٹیکنالوجی، معیشت، ملک کے آئین وقوانین اور سماجی موشگافیوں سے بھی بخوبی واقف ہوں۔

ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ آج کی دنیا میں صرف تعداد طاقت نہیں۔ علم طاقت ہے، تنظیم طاقت ہے، معیشت طاقت ہے، ادارہ سازی طاقت ہے، اخلاقی ساکھ طاقت ہے اور سب سے بڑھ کر کسی قوم کا باہمی اتحاد اور اجتماعی صلاحیت اس کی اصل قوت ہوتی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری آواز سنی جائے تو ہمیں اپنی آواز کو علم، کردار اور کارکردگی کی قوت دینا ہوگی۔

ہندوستان جیسے وسیع اور متنوع ملک میں یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہاں مختلف مذاہب، زبانوں، ثقافتوں اور تہذیبی روایتوں کے حامل لوگ ایک مشترک قومی زندگی میں شریک ہیں۔ ایسے ملک کی تعمیر کسی ایک طبقے کی فتح سے نہیں بلکہ سب کے حقوق، عزت اور مساوی شہری حیثیت کے احترام سے ہوگی۔ اس لیے ہمیں ہر اس فکر اور رویے سے بچنا ہوگا جو نفرت کو معمول، اختلاف کو دشمنی اور شناخت کو تصادم کا ذریعہ بنا دے۔

مسلمانوں کے لیے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اپنے تشخص سے دست بردار ہو جائیں۔ اس کے برعکس، مضبوط تشخص ہی انسان کو پُراعتماد بناتا ہے، لیکن مضبوط تشخص کا مطلب دوسروں سے نفرت نہیں، بلکہ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کے حقوق کا احترام ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا:

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ" (المائدۃ، 8)

(کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، تم انصاف کرو، یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔)

یہ اصول ہمارے اجتماعی رویے کی بنیاد ہے۔ ہمیں ناانصافی کے خلاف آواز بھی اٹھانی ہے اور انصاف کے اصول سے خود بھی وابستہ رہنا ہے۔ ہمیں اپنے حقوق کا مطالبہ بھی کرنا ہے اور دوسروں کے حقوق کا احترام بھی ملحوظ رکھنا ہے، ہمیں اپنے لیے آزادی اور عزت مطلوب ہے تو دوسروں کے لیے بھی وہی اصول تسلیم کرنا ہوگا۔

لیکن اس کے ساتھ ایک اور اہم سوال بھی ہے: ہم اپنی اجتماعی قوت کو کس سمت استعمال کریں؟

ہماری توانائی کا بڑا حصہ باہمی اختلافات میں صرف ہو جاتا ہے۔ معمولی مسائل بڑے تنازعات بن جاتے ہیں، شخصیات اصولوں پر غالب آ جاتی ہیں اور ادارہ سازی کے بجائے شخصی وابستگی ہماری ترجیحات طے کرنے لگتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ضروری ہے کہ ہم اختلاف کو دشمنی نہ بننے دیں۔ ایک زندہ معاشرے میں اختلاف ہوگا، رائے کا تنوع ہوگا،

فکری بحث ہوگی۔لیکن اختلاف کا مقصد اصلاح ہونا چاہیے، باہمی تحقیر نہیں۔

ہمیں اپنے مدارس، مساجد، تعلیمی اداروں، سماجی تنظیموں اور رفاہی اداروں کو نئے تقاضوں کے مطابق زیادہ مؤثر بنانا ہوگا۔ مدرسہ صرف ماضی کی حفاظت کا مرکز نہ ہو بلکہ مستقبل کے لیے علمی قیادت تیار کرے۔ مسجد صرف عبادت کی جگہ نہ ہو بلکہ اخلاقی تربیت، سماجی خیر اور باہمی اخوت کا مرکز بھی بنے۔ تعلیمی ادارے صرف امتحان پاس کرنے والے افراد پیدا نہ کریں بلکہ ذمہ دار، باکردار اور باصلاحیت شہری تیار کریں۔

معاشی میدان میں بھی خود کفالت کی ضرورت ہے۔ جو قوم معاشی طور پر کمزور ہو، وہ اپنے اجتماعی فیصلوں میں ہمیشہ دوسروں کی محتاج رہتی ہے۔ تجارت، صنعت، ہنر، پیشہ ورانہ تعلیم اور جدید کاروباری میدانوں میں ہماری نئی نسل کو آگے آنا ہوگا۔ دولت صرف ذاتی آسائش کا ذریعہ نہیں ہے، اگر اسے صحیح شعور کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ تعلیم، صحت، تحقیق اور ادارہ سازی کی قوت بن سکتی ہے۔

اسی طرح علمی میدان میں ہمیں تحقیقی مزاج سازی اور اپنے مسائل پر علمی کام کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ دنیا بدل رہی ہے، ٹیکنالوجی نئی سمتیں پیدا کر رہی ہے، مصنوعی ذہانت سے لے کر معاشی نظام تک ہر شعبہ تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ جو قوم ان تبدیلیوں کو سمجھنے میں ناکام رہ جائے گی، وہ اپنی جگہ خود بخود کھو دے گی، اور اپنا امتیاز محفوظ نہیں رکھ سکے گی۔

یہی وہ موڑ ہے جہاں شعر کا ''شیشہ'' ہمارے لیے ایک جامع استعارہ بن جاتا ہے۔ شیشہ کوئی ایک چیز نہیں، یہ علم بھی ہے، حکمت بھی، کردار بھی، تنظیم بھی، قانون دانی بھی، معاشی قوت بھی اور باہمی اتحاد اور اجتماعی بصیرت بھی ہے۔ پتھر خواہ کتنا ہی سخت ہو، اس کے مقابل ایک ایسی حکمتِ عملی پیدا کی جاسکتی ہے جو اس کی سختی کو بے اثر کر دے۔

ہر مسئلہ محاذ آرائی سے حل نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ایک مضبوط دلیل وہ کام کرتی ہے جو ایک بلند نعرہ نہیں کر سکتا۔ ایک معیاری ادارہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو سو تقریریں نہیں کر سکتیں۔ ایک باصلاحیت نوجوان آنے والی پوری نسل کی سمت بدل سکتا ہے۔ ایک دیانت دار تاجر اپنے گرد اعتماد کی ایسی فضا قائم کر سکتا ہے جو کئی خطابات سے زیادہ مؤثر ہو۔ ایک اچھا استاد خاموشی سے ایسے ذہن تیار کر سکتا ہے جو قوم کی بھنور میں پھنسی کشتی ساحل پر پہونچا سکتے ہیں۔

اس لیے ہمیں فوری نتائج کے فریب سے نکلنا ہوگا۔ تعمیر ہمیشہ وقت لیتی ہے۔ ایک مضبوط عمارت ایک دن میں نہیں بنتی، ایک باصلاحیت نسل ایک تقریر سے تیار نہیں ہوتی اور ایک مستحکم معاشرہ چند جذباتی فیصلوں سے وجود میں نہیں آتا۔ ہمیں طویل سفر کے لیے تیار ہونا ہوگا۔

یہاں ہماری ذمہ داری صرف اپنی ذات تک محدود نہیں۔ ہمیں اپنے بعد آنے والی نسل کے بارے میں ترجیحی بنیاد پر سوچنا ہوگا۔ ہم آج جو ادارے قائم کریں گے، جو تعلیمی نظام بنائیں گے، جو اخلاقی اقدار منتقل کریں گے اور جو اجتماعی رویے اختیار کریں گے، وہی کل ہمارے بچوں کے ماحول کا حصہ بنیں گے، اور اسی نہج پر ان کی پرداخت ہوگی۔

ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ آنے والی نسل کو ہم کیا دیں گے، خوف یا اعتماد، مایوسی یا امید۔ شکایت یا صلاحیت۔ ماضی کا فخر یا مستقبل کی تیاری؟ یہ فیصلہ آج ہمیں کرنا ہوگا۔

حالات کا جبر اپنی جگہ، مگر حالات کبھی تاریخ کا آخری فیصلہ نہیں ہوتے۔ تاریخ کے نازک موڑ پر اصل فیصلہ اس بات سے ہوا ہے کہ کسی قوم نے اپنی کمزوری کو اپنی تقدیر سمجھ لیا یا اسے اپنی تعمیر کا نقطۂ آغاز بنالیا۔ جن قوموں نے شکست کو شناخت بنالیا، وہ وقت کے حاشیے پر چلی گئیں، اور جنہوں نے شکست کے اندر سے سبق، مایوسی کے اندر سے امید اور انتشار کے اندر سے نظم پیدا کیا، انہوں نے اپنے لیے نئے امکانات پیدا کر لئے۔

اس لیے ہمیں نہ محض شکوہ درکار ہے، نہ جذباتی احتجاج، نہ ماضی کے قصوں سے دل بہلانے کی ضرورت۔ ہمیں اپنے اس دور کو سمجھنا ہوگا، اپنی کمزوریوں کا بے لاگ احتساب کرنا ہوگا اور پھر اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہوگا کہ ہم اپنے حصے کی تاریخ کیسے بدل سکتے ہیں؟

یہ کام کسی ایک فرد، جماعت یا ادارے کے بس کا نہیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنے گاؤں سے شہر تک، مدارسِ اسکولز اور کالجز سے یونیورسٹی تک اور فرد سے اجتماع تک، ایک مسلسل فکری و عملی بیداری درکار ہے۔ ہمیں ایسی نسل تیار کرنی ہوگی جو اپنے دین سے وابستہ ہو، مگر دنیا کے مسائل سے بے خبر نہ ہو، اپنی تہذیب پر مطمئن ہو، مگر تحقیق کے دروازے بند نہ کرے، اپنے حقوق کے لیے بیدار ہو، مگر دوسروں کے حقوق سے غافل نہ ہو، اور مشکل حالات میں مشتعل ہونے کے بجائے زیادہ منظم، زیادہ باصلاحیت اور زیادہ باکردار بنے۔

آج ہمیں اسی شیشے کی تلاش ہے۔ وہ کسی ایک شخص کے پاس نہیں، ہماری اجتماعی بیداری میں چھپا ہوا ہے، وہ کسی ایک نعرے میں نہیں، ہزاروں خاموش محنتوں میں جنم لے گا، وہ کسی فوری فتح کا نام نہیں، بلکہ اس طویل سفر کا آغاز ہے جس میں علم، کردار، اتحاد، صبر، قانون پسندی اور مسلسل جدوجہد ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھتے ہیں۔

وقت ہم سے معجزے کا مطالبہ نہیں کر رہا، وہ ہم سے اپنی ذمہ داری ادا کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ہمیں اپنے حصے کا چراغ جلانا ہے، اپنے حصے کی دیوار میں شگاف ڈالنا ہے، اپنے حصے کی نسل کو سنوارنا ہے اور اپنے حصے کا مستقبل تعمیر کرنا ہے۔

پھر کل جب تاریخ پلٹ کر ہمارے عہد کو دیکھے تو اسے یہ نہ کہنا پڑے کہ ایک مشکل زمانہ آیا تھا اور ایک قوم خوف زدہ ہو کر بیٹھ گئی تھی، بلکہ یہ لکھنا پڑے کہ پتھر بہت تھے، مگر اس بہادر قوم نے وہ شیشہ تلاش کر لیا تھا جو پتھروں کو توڑ سکے اور اپنا راستہ خود تیار کر سکے۔

تہذیب کی عریانیت

مولانا محمد مسعود عالم قاسمی

ایک ایسے زمانے میں جہاں بازاروں سے لے کر دفتروں، کلبوں اور تفریح گاہوں میں اور تماشا گاہوں سے لے کر کھیل کے میدان تک میں عورت کے نسوانی حسن کی نمائش کو روشن خیالی اور ترقی کی علامت قرار دیا جاتا ہو اور ایک ایسے معاشرہ جہاں مرد تو سر سے پاؤں تک لباس میں ڈھکا رہتا ہو، مزید کوٹ اور ٹائی استعمال کرتا ہو اور عورت کے لیے تقریباً غیر شائستہ لباس کو اس کی زینت سمجھا جاتا ہو، کسی عورت کو یہ مشورہ دینا کہ اس کا بہترین مقام اس کا گھر ہے، یقیناً دقیانوسی، رجعت پسندی اور پچھڑے پن کی بات سمجھی جائے گی اور عجب نہیں کہ اسے مسلمانوں کے فرسودہ اخلاق کی بازیافت کہہ کر مسترد کر دیا جائے۔ مگر یہ مشورہ کسی از کارِ رفتہ، معلم اخلاق یا دقیانوسی انسان کا نہیں، بلکہ ماضی قریب کی مغربی دنیا کی مشہور فلمی اداکارہ کیٹ ہڈسن کا ہے، فلمی دنیا اور اداکاری اور جسم کی نمائش کا طویل کیریر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچی ہے۔

I think the greatest thing when you are a female who is always is the remember that your place is the .....out and about (04.07. Delhi 23.Hindustan tiems)."home

''میرا خیال ہے کہ سب سے بڑی چیز ایک ایسی عورت کے لیے جو ہمیشہ باہر پھرتی ہے اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا بہترین مقام اس کا گھر ہے۔''

برطانیہ میں دیے گئے اپنے حالیہ انٹرویو میں انہوں نے عورتوں کو یہ مشورہ دینے کے ساتھ اس خواہش اور ارادہ کا بھی اظہار کیا کہ: ''وہ فرض شناس بیوی اور مشفق ماں بن کر زندگی گزارنا چاہتی ہے''۔

آج کی دنیا میں جوان لڑکے اور لڑکیاں جس طرح فلمی ستاروں پر جان چھڑکتے ہیں، ان کی تصویریں سجا کر رکھتے ہیں، ان کے نقشِ قدم پر چلنے اور ان کا رول اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور ان سے ملاقات کرنے کی حسرت پالتے رہتے ہیں، ایسی پرکشش اور چمک دمک کی دنیا کی کسی اداکارہ کی یہ خواہش کہ وہ فرض شناس بیوی اور مشفق ماں بننا چاہتی ہے اور عورتوں کو یہ مشورہ دینا کہ وہ شمع محفل بننے کے بجائے گھر کی زینت بننے کی کوشش کریں، میڈیا اور مغربی مزاج کی مخالفت کو دعوت دینا ہے، آج کی دنیا اسے رجعت پسندی سے تعبیر نہ کرے تو اور کیا کرے؟! میڈیا نے کیا بھی یہی، ہڈسن کا انٹرویو شائع کرنے کے ساتھ اس پر (Old fashioed view) (دقیانوسی خیال) کی پھبتی کسی اور نسوانی فطرت کی آواز کی حیثیت کم کر دی، مزید یہ کہ انٹرویو کے ساتھ اس کی نہایت غیر شائستہ تصویر شائع کر کے دنیا کو یہ بتایا کہ اس پرکشش ماڈلنگ

کے ساتھ یہ فرسودہ خیال میل نہیں کھاتا، نئے زمانہ کا تقاضا کچھ اور ہے۔

وہ ہوس پرست طبقہ اور آوارہ مزاج معاشرہ جو عورت کے فطری منصب ومقام کو نظر انداز کر کے اس کی جنسیت کو ابھارتا ہو اور اس سے منصب مادری چھین کر "گرل فرینڈ" اور "کال گرل" بننے کی راہ دکھاتا ہو، اسے گھر سے نکال کر ہوٹلوں، کلبوں، تفریح گاہوں میں، فلم کے پردہ پر، ٹی وی اور انٹرنیٹ کے شیشہ پر اور پبلک مقامات پر، عریاں کر کے لاتا ہو اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہو، وہ کیسے سمجھے کہ عورت کی سچی اُمنگ کیا ہے، اس کی خواہشوں اور تمناؤں کی حقیقی دنیا کیا ہے؟ اور جس عورت کو اس نے ناچنے، گانے اور سامانِ جنس بننے پر مجبور کیا ہے، وہ کس اندرونی کرب اور نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہے، وہ اس کے جسمانی حسن وجمال کو دیکھتا ہے، مگر اس کی روح کی آواز سننے سے قاصر ہے، بقول شاعر.....#

اس دور کی یہ ناچتی ہوئی تہذیب　　کیا جانیے کس کرب کا اک اظہار کرے

رقص وسرور، عیش ونشاط، شراب وشباب کی ہنگامی دنیا میں عورت جب تک پھنسی رہتی ہے، اس وقت تک اسے اپنی حیثیت کا خیال نہیں آتا، اپنی عصمت کی قدر وقیمت کا اندازہ نہیں ہوتا اور نہ اپنے مقصد زندگی کی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے، مگر جب کبھی اس کا شعور بیدار ہوتا ہے، اس کی نسوانیت جاگتی ہے تو اسے اپنی حقیقت اور حیثیت کا احساس بھی ہوتا ہے اور وہ مصنوعی زندگی سے حقیقی زندگی کی طرف لوٹنا چاہتی ہے، اپنی فطرت کی پکار سنتی ہے، اداکاری اور جنسی بے راہ روی کے بجائے فرض شناسی اور سعادت مند خاندانی زندگی گزارنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ مصنوعی جال سے نکلنے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہے اور ہوس پرست معاشرہ اسے جنسی غلامی سے آزاد ہونے کا کتنا حق دیتا ہے۔

یہ فلمی دنیا کا ہی حال نہیں، ملازمت اور سماجی وفوجی خدمت تک میں عورت سے اس کی نسوانیت چھین کر اس پر عریانیت مسلط کی گئی ہے اور امومت کی ذمہ داری سے ہٹا کر بے راہ روی کی عادت لگا دی گئی ہے۔ ایک وقت تک تو عورت نئی دنیا کے منافع حاصل کرنے کے شوق میں اپنی اس زندگی سے لطف اندوز ہوتی ہے، مگر جب اس کو حادثات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس کا نقطہ نظر بھی ہڈسن کی طرح حقیقت پسند اور معروضی ہو جاتا ہے۔

عورتوں کو آزادی اور مساوات کے نام پر گھر سے باہر نکال کر بازار، بلکہ جنگ کے میدان میں لانے میں یورپ کے ساتھ امریکا کا بڑا رول ہے، امریکی فوج میں دو لاکھ سے زیادہ عورتیں شامل ہیں۔ فوجی خدمات تو ان کا سرکاری اور ملکی فریضہ ہے، مگر اس سے کہیں زیادہ وہ فوجی مردوں اور آفیسروں کی جنسی خدمات بجالانے پر مجبور ہیں۔ اس مجبوری نے ان کو جن نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کر دیا ہے اس کا اندازہ ایک سابق امریکی فوجی ماریان ہڈا کی داستانِ زندگی کے اس اظہار سے لگایا جاسکتا ہے۔ "پہلے جب میں امریکی جھنڈے پر نظر ڈالتی تھی تو یہ مجھے سرخ، سفید اور نیلا دکھائی دیتا تھا، مگر اب میں اس پر صرف خون کے دھبے دیکھتی ہوں، سرخ رنگ اس خون کی علامت ہے، جو میرے بدن سے بہا، نیلا رنگ ان چوٹوں کی نمائندگی کرتا ہے جو میرے جسم نے سہیں اور سفید رنگ میرے خوف زدہ چہرہ کا ہے، میں اپنے ملک کے لیے ماری پیٹی گئی اور

میری عزت لوٹی گئی، اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے؟!"

ماریان ہڈا کی دردناک کہانی آزادیٔ نسواں کی تہذیب پر بدنما داغ ہے، مگر یہ انوکھا واقعہ نہیں، امریکا کے لوواسٹی میں سابق فوجیوں کے میڈیکل سینٹر کی ایک انکوائری 2003ء سے پتہ چلتا ہے کہ جن 558 عورتوں کا انٹرویو لیا گیا ان میں سے 28 فی صد نے بتایا کہ فوجی ملازمت کے دوران ان کی عصمت دری کی گئی یا اس کی کوشش کی گئی۔ یہ حال ان عورتوں کا ہے جنھوں نے اپنے جنسی استحصال پر لب کشائی کی، ورنہ پینٹا گون کا 1988ء کا سروے یہ بتاتا ہے کہ فوج میں مردوں کے ہاتھ جنسی بدسلوکی کا نشانہ بننے والی 90 فیصد خواتین متعلقہ حکام کو اپنی مظلومیت کی اطلاع مختلف اسباب کی وجہ سے نہیں دیتیں۔

امریکی معاشرے اور مغربی دنیا نے عورت سے اس کی نسوانیت اور غیرت اس حد تک چھین لی ہے کہ اذیت دیتے ہیں تو اذیت کی شکل نہایت شرم ناک ہوتی ہے (جس کی تفصیلات میڈیا میں آچکی ہیں) مساوات اور آزادیٔ نسواں کے دل فریب نعرے اپنی جگہ اور نعرہ لگانے والوں کی ہول ناکی اور شہوت پرستی کے کارنامے اپنی جگہ، ان خوش نما نعروں نے عورتوں کو گھروں سے تو اٹھالیا، مگر میدان کارزار میں لاکر ان کا بری طرح استحصال کیا اور نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کردیا، ایسے میں اگر ان کو گھر کے تقدس کا خیال آئے، اپنی نسوانیت اور عصمت کا احساس جاگے، تو یہ رجعت پسندی نہیں، حقیقت پسندی ہے، دقیانوسیت نہیں، انسانی فطرت ہے اور جب فطرت سے بغاوت کی جائے تو دیر یا سویر اس کا خمیازہ ضرور بھگتنا ہوگا۔

عورتوں کے جنسی استحصال کے لیے آپ کو میدانِ جنگ میں جانے کی ضرورت نہیں، مخلوط تعلیم کے جو ادارے ہر جگہ قائم ہیں، اسکول، کالج، انسٹی ٹیوٹ اور یونی ورسٹی کے نام پر وہاں کچی عمر سے ہی لڑکیوں سے نسوانیت ترک کرکے عریانیت کی راہ پر لگادیا جاتا ہے، یہ اعلان کہ "لڑکے اور لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں" بظاہر کتنی ہی معصوم اور بے ضرر آواز کیوں نہ ہو، مگر اس نے خاندان میں لڑکیوں کی پیدائش کی ناگواری کو آج تک کم نہیں کیا اور نہ بیٹوں کی۔ اس طرح ماں باپ کی جائیداد میں بیٹیوں کو حصہ نہ دلایا، کالجوں میں شرم وحیا کے احساس کو ضرور ختم کیا اور جنسیت کی حدود کو حیوانیت سے ضرور ملا دیا، جس بے راہ روی اور آوارگی کا مشاہدہ عام طور سے ہوتا رہتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ دلاور فگار کا طنز آج حقیقت میں تبدیل ہوچکا ہے.....#

عام ہوگی عاشقی کالج کے عرض وطول میں　　لیلیٰ ومجنوں نظر آئیں گے ہر اسکول میں

تعلیم گاہوں کا یہ سبق ان کو حقیقی زندگی اور اس کے تقاضوں سے جس طرح دور کرتا ہے اور رومان بھری زندگی میں جس طرح داخل کرتا ہے، اس کا براہِ راست اثر یہ ہوتا ہے کہ ملک میں اخلاق باختگی عام ہوتی ہے، رضا کارانہ بدکاری کے ساتھ جبری بدکاری عام ہوتی ہے، رقابت کے لیے قتل ہوتا ہے، امن وانتظام کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور پولیس آفیسرز کو کہنا پڑتا ہے کہ "اگر لڑکیوں کا لباس ٹھیک کردیا جائے تو امن وانتظام کے بگاڑ میں کمی آسکتی ہے"۔

یہ لڑکیاں جنھوں نے یہ تعلیم پائی ہو اور ایسے ماحول میں زندگی گزاری ہو، ان کو ہوٹل کے شب گزیدہ کمرے اچھے

لگیں گے، مساج پارلر میں جی لگے گا، اس کے مقابل میں چادر اور چار دیواری کے نام سے نفرت ہوگی، ان کو گھر قید خانہ لگے گا، عفت رجعت پسندی لگے گی، فرض شناس بیوی بننا اسے بوجھ معلوم ہوگا اور امومت کا تقدس معیوب لگے گا، علامہ اقبال نے بلاوجہ تو نہیں کہا تھا...#

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کے تاثیر سے زن ہوتی ہے نارن کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

عملی زندگی میں اس تعلیم وتربیت کے اثرات کیا ہیں، اس کی ایک تفصیل ہندوستان کے کثیر الاشاعت انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز دہلی 9/مئی 2004ء کی اشاعت میں دیکھی جاسکتی ہے، "مارکیٹ ریسرچ ایجنسی" کی سروے رپورٹ اپریل 2004ء دہلی کے خوش حال طبقہ سے تعلق رکھنے والی 25/تا35/سال کی 503 خواتین کے انٹرویو پر مشتمل ہے۔ یہ عورتیں جس بے باکی سے اپنے جنسی احساسات اور جنسی تجربات کا اظہار کرتی ہیں، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے فرض شناس بیوی اور شفیق ماں کے کردار کو ٹھکرا کر باہر کی چمک دمک کو زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہے۔ اس تناظر میں ہڈسن کا مشورہ جب میری نظروں سے گزرا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے قرآن کی روشنی اس کے دل میں اتر گئی ہو اور وہ الہامی ہدایت کے الفاظ دہرا رہی ہو، جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے تھے، یعنی: ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ (الاحزاب، آیت: 33) "ان عورتوں سے کہو کہ تم اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور سابق زمانہ جاہلیت کی سج دھج نہ دکھاتی پھرو"۔

انسان کے پیدا کرنے والے خدائے پاک نے انسان کی معاشرتی پاکیزگی کا جو انتظام کیا ہے، اس میں مرد و عورت کے دائرہ کار کی تعیین کو بڑا دخل ہے۔ عورتیں اگر گھر کی ذمہ داری نبھائیں، بیوی کے کردار اور ماں کی عظمت کو محسوس کریں تو مردوں کو باہر کی دنیا کی تعمیر وترقی کے انتظام کے لیے یکسو اور فارغ کرسکتی ہیں، مگر جب وہ اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوکر، سج دھج کر باہر نکلتی ہیں تو تعمیر کا عمل رکتا ہے، تخریب کا عمل شروع ہوتا ہے اور معاشرہ میں فساد کا زہر سرایت کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "عورت قابلِ مستور ہے، جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو گھورتا ہے اور جب وہ اپنے گھر میں ہوتی ہے تو اللہ کی رحمت سے قریب ہوتی ہے"۔ (ترمذی)

عورت کی معاشی کفالت مردوں کے ذمہ ہے، اس لیے اسے تلاشِ معاش کے لیے بھٹکنے کی ضرورت نہیں اور اگر اسے معاشی کفالت حاصل نہ ہو تو ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے باہر جاسکتی ہے، مگر ضرورت کے لیے باہر جانے اور فیشن کے لیے باہر نکلنے میں بڑا فرق ہے، ایک جگہ ضرورت کی تکمیل ہے اور دوسری جگہ ہوس کی تسکین ہے، ایک جگہ ذمہ داری کا احساس ہے، دوسری جگہ ذمہ داری سے فرار ہے، اسی طرح ذمہ داری اور محرم کے ساتھ باہر نکلنے اور آشنا کے ساتھ باہر نکلنے کے مطلب میں بڑا فرق ہے۔

جدید سائنس نے عدت کی حکمت کی تصدیق کردی

مولانا انیس الرحمن ندوی

عدت کے تعلق سے آج کل ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ طلاق یا شوہر کے انتقال کے بعد عورتیں عدت کیلئے آج سائنٹفک طریقہ کیوں نہیں اپنا سکتی ہیں؟ یعنی ایسی عورتوں کا pregnancy test کروایا جانا چاہئے، اگر عورت حاملہ ہو تو وہ عدت پوری کریں اور اگر ٹیسٹ منفی آئے تو پھر ان پر عدت ساقط مانی جانی چاہئے، چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے ایسا حکم اسلام کے دین فطرت ہونے کی نمائندگی بھی کرے گا۔ بلاشبہ اسلام دین فطرت ہے۔ دراصل اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر ہر پہلو کی راہنمائی کرتا ہے۔ ازدواجی زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل میں بھی اسلام نے نہایت حکمت وبصیرت سے احکام دئے ہیں، انہی احکام میں ایک اہم حکم عدت waiting period کا ہے، جو نہ صرف عورت کی عزت ووقار کی حفاظت کرتا ہے بلکہ معاشرتی نظم وضبط کو بھی قائم رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں جدید سائنسی تحقیقات نے عدت کی حکمت ومصلحت اور اس کی گہرائی اور گیرائی کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی معنویت ومصداقیت کی ایک نئے جہت فراہم کردی ہے، جس سے شریعت اسلامی کے اعجازی پہلو ظاہر ہوتے ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عدت صرف انتظار نہیں ہے بلکہ وہ ایک گہرا فطری، سائنسی اور روحانی عمل ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عدت کا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں۔ لیکن درحقیقت، عدت کا تصور صرف حمل کے امکان تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل، سائنسی، طبی اور روحانی حکمت پر مبنی مدت ہے، جس کا تعلق عورت کے جسم، ذہن اور جذبات کے توازن سے بھی ہے۔

جدید میڈیکل سائنس نے ثابت کیا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی رابطہ کے بعد مرد کے نطفے sperm کے اجزاء صرف چند دنوں تک نہیں، بلکہ کئی مہینوں تک عورت کے جسم میں موجود رہ سکتے ہیں، یہ اجزاء نہ صرف عورت کے رحم میں بلکہ اس کے خون، ہڈیوں، حتیٰ کہ دماغ میں بھی trace کئے جا سکتے ہیں، اس کیفیت کو سائنسی اصطلاح میں microchimerism کہا جاتا ہے، یعنی ایک مرد کے خلیے عورت کے جسم میں مہینوں تک موجود رہتے ہیں اور اس کے جسمانی نظام پر اثر ڈالتے ہیں۔

عدت کے سلسلے میں دو سائنسدانوں کی تحقیقات کافی اہم ہیں۔ ایک ڈاکٹر جمال الدین ابراہیم اور دوسرے ڈاکٹر رابرپ گلہیم، ڈاکٹر جمال الدین ابراہیم مصری ہیں اور Toxicology and Biological Chemistry کے ماہر ہیں، انہوں نے ڈی این اے اور خلیاتی یادداشت Cellular Memory پر تحقیق کرتے ہوئے یہ معلوم کیا کہ ''عورت کے رحم میں مرد کے ڈی این اے اور حیاتیاتی اثرات لمبے عرصے تک محفوظ رہتے ہیں، اگر ایک عورت بغیر عدت مکمل

کئے دوبارہ شادی کرے تو سابق شوہر کے DNA کے اثرات نئے شوہر کے DNA کے ساتھ کیمیکل طور پر متصادم ہو سکتے ہیں، یہ تنازعہ عورت کی اولاد، رحم کی صحت اور جذباتی کیفیت پر منفی اثر ڈال سکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ تقریباً ۳/ماہ کا عرصہ یا تین حیض کا گزرنا، عورت کے جسم کو مکمل طور پر صاف detox کرنے کے لئے ضروری ہے۔

دوسرے سائنسدان ڈاکٹر رابرٹ گلہیم ہیں جو ایک فرانسیسی سائنسدان ہیں، جنہوں نے نکاح کے بعد عورت کے جسم میں مرد کے اثرات پر تحقیق کی، اُن کی تحقیق سے درج ذیل باتیں سامنے آئیں: (۱) ہر مرد کا ایک منفرد بیولوجیکل کوڈ ہوتا ہے، جو جماع کے دوران عورت کے جسم میں منتقل ہوتا ہے۔ (۲) عورت کے جسم میں یادداشت کے خلیے memory cells سابقہ مرد کے کوڈ کو محفوظ رکھتے ہیں۔ (۳) اگر عورت فوراً نیا تعلق قائم کرے، تو کئی حیاتیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں، جن میں بچے کی صحت پر اثر، جینیاتی پیچیدگیاں اور جذباتی عدم توازن شامل ہیں۔

یہاں پر ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر رابرٹ گلہیم ایک یہودی تھے اور جب انہیں اسلام میں مطلقہ اور بیوہ کی عدت کی مشروعیت کے متعلق معلوم ہوا تو انہوں نے اسلام کے ایک برحق دین ہونے کا اقرار کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔

بہر حال، امریکہ کے ادارہ ءصحت NIH سمیت کئی تحقیقی ادارے بھی اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں کہ مرد کا جینیاتی مواد عورت کے جسم میں تین سے چار ماہ تک رہ سکتا ہے، یہ خلیے عورت کے ہارمون، مدافعتی نظام اور جسمانی توازن کو متاثر کرتے ہیں۔ ان سائنسی دریافتوں نے قرآن کے اس حکم کی حیران کن تصدیق کی ہے کہ عورت کو طلاق یا بیوگی کے بعد عدت گزارنی چاہئے جو: (۱) طلاق کی صورت میں: تین حیض یعنی تقریباً تین ماہ ہے۔ (۲) شوہر کی وفات کی صورت میں: چار ماہ اور دس دن ہے۔

یہ مدت عورت کے جسم کو سابقہ تعلق کے اثرات سے پاک کرنے اور ایک نئے مرحلے کے لئے مکمل طور پر تیار کرنے کیلئے قدرتی طور پر موزوں ہے۔ اس دوران رحم صاف ہو جاتا ہے، ہارمون توازن میں آجاتے ہیں، اور مدافعتی نظام نئے ممکنہ تعلق کو قبول کرنے کے لئے خود کو تیار کرتا ہے۔ یہ ایک مکمل حیاتیاتی ری سیٹ reset کی مانند ہوتا ہے، لہٰذا عدت نہ صرف جسمانی صفائی کا عمل ہے، بلکہ یہ عورت کے لئے ایک روحانی و ذہنی سکون کا وقت بھی ہے۔ وہ اس دوران اپنے جذبات، غم اور آنے والی زندگی کے لئے خود کو سنبھال سکتی ہے۔ اسلئے یہ کہنا کہ عدت صرف حمل جانچنے کے لئے ہے یا آج کل چونکہ pregnancy test موجود ہے اس لئے عدت کی ضرورت نہیں، ایک سطحی اور لاعلمیت پر مبنی بات ہے۔

عدت کو نظر انداز کرنے کے خطرات: اب یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا عدت کے دوران نکاح یا جنسی تعلق طبی اعتبار سے نقصان دہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا microchimerism کے باعث عدت کی خلاف ورزی سے عورت کو کسی قسم کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے؟ اس سلسلے میں جدید سائنسی تحقیقات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں عورت کو اسکے بڑے سنگین طبی و صحی خطرات لاحق ہوں گے جن کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

مدافعتی نظام کی الجھن: عدت میں عورت کے جسم میں پچھلے شوہر یا مرد کے خلیاتی باقیات cellular remnants موجود ہوتے ہیں، اور عورت کا جسم پچھلے مرد ساتھی کے خلیات یا جینیاتی ذرات کو ابھی تک پراسیس کر رہا ہوتا ہے۔ اس دوران اگر عورت دوسری مباشرت میں جائے اور نیا ڈی این اے اس کے جسم میں داخل ہو تو دو مختلف مردوں کے جینیاتی مواد کا عورت کے جسم میں overlap ہوسکتا ہے اور اس سے مدافعتی نظام میں پیچیدگیاں یا بے ترتیبی پیدا ہوسکتی ہے۔ جس سے اس کے صحت کو سنگین قسم کے خطرات لاحق ہوتے ہیں۔

سوزش اور تولیدی صحت کے مسائل: نئی تحقیقات یہ اشارہ دیتی ہے کہ تولیدی بافتوں reproductive tissues میں ایک سے زائد مردوں کا جینیاتی مواد موجود ہونے سے بعض تولیدی مسائل کا خطرہ بڑھ سکتا ہے، جیسے کہ: اسقاط حمل، بانجھ پن، خود مدافعتی autoimmune ردعمل وغیرہ۔

حمل میں جینیاتی الجھن: بعض صورتوں میں، مائیکروچیمر یزم microchimerism غیر متوقع جینیاتی امتزاج کا باعث بن سکتا ہے۔

ہارمونی اور جذباتی اثرات: ہر جنسی تعلق عورت کے ہارمونی اور جذباتی نظام کو متاثر کرسکتا ہے۔ تیزی سے ایک تعلق سے دوسرے تعلق میں جانا ذہنی صحت، جذباتی وابستگی کی صلاحیت، اور ہارمونی توازن کو متاثر کرسکتا ہے، اور عورت کا tissue repair mechanisms متاثر اور خراب ہوسکتے ہیں۔

کینسر کے خطرات: اس سلسلے میں چونکانے والی متعدد سائنسی تحقیقات سامنے آچکی ہیں کہ عدت کے وقفے میں ایک سے زائد مرد کا DNA داخل ہونے سے اس عورت کو کئی قسم کے کینسر کے خطرات لاحق ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔ جن میں عنق رحم کا سرطان (سروائیکل کینسر) اور چھاتی کا سرطان (بریسٹ کینسر) قابل ذکر ہیں۔ لہذا عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ کینسر ان خواتین کو لاحق ہوتا ہے جو ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات رکھتی ہیں۔ آج عالمی پیمانے پر مختلف قسم کے کینسروں میں زیادتی کی ایک اہم وجہ آزادانہ جنسی تعلقات کو قرار دیا جارہا ہے، جس میں ایک عورت بیک وقت ایک سے زائد مردوں سے جنسی تعلقات استوار کرتی ہے۔ لہٰذا ایسی صورتوں میں کینسر پہلے عورتوں کے جسم میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اس سے جنسی طور پر رابطہ میں آنے والے افراد کو منتقل ہوکر دوسروں تک پھیلنے کا سبب بنتا ہے۔ بہرحال، اسلام نے چودہ سو سال پہلے عدت کا وہ پاکیزہ نظام دیا جسے آج سائنس بھی تسلیم کررہی ہے۔ شریعت کے احکامات نہ صرف روحانی اور اخلاقی لحاظ سے بلند ہیں بلکہ طبی اور سائنسی لحاظ سے بھی فطرت کے عین مطابق ہیں لہٰذا عدت عورت کے جسم، ذہن اور روح کو سابقہ تعلق کے اثرات سے پاک purification کرنے اور ایک نئی شروعات کے لئے تیار کرنے کا ایک قدرتی اور حکیمانہ عمل ہے۔ یہ شریعت کا وہ نظام ہے جس میں انسان کی فطرت، صحت اور عزت کا مکمل خیال رکھا گیا ہے۔

نئی نسل کدھر جارہی ہے؟

مولانا سید احمد ومیض ندوی

کسی بھی قوم کی سرخ روئی اور سربلندی کا سہرا اس کی نئی نسل اور نوجوانوں کے سر جاتا ہے، جس قوم کے نوجوان اعلیٰ کردار اور بلند اخلاق کے حامل اور مذہبی اقدار کے محافظ و پاسبان ہوتے ہیں، کامیابی اس کے قدم چومتی ہے، وہ قوم دنیا میں سرخ رو اور آخرت میں فلاح یاب ہوتی ہے، اس کے برخلاف جس قوم کے نوجوان حیا باختہ، بے لگام خواہشات نفسانی کے اسیر اور اعلیٰ مذہبی روایات سے تہی دامن ہوتے ہیں وہ قوم قعر مذلت میں جا گرتی ہے، نہ صرف وہ آخرت میں رحمت الٰہی سے دور ہوتی ہے، بلکہ دنیا میں بھی ذلت وادبار اس کا مقدر ٹھہرتا ہے۔

امت مسلمہ کی موجودہ زبوں حالی اور اس کی ہمہ گیر ذلت وخواری کا ایک بنیادی سبب اس کی نئی نسل کی بے راہ روی اور مسلم نوجوانوں کی دین بیزاری ہے، اس وقت جس تیزی کے ساتھ ہماری نئی نسل بے راہ روی کا شکار ہورہی ہے، اسے دیکھ کر بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی تباہی کے سارے سامان اکٹھے کرلیے ہیں، بے حیائی اور فحاشی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، سیل فون کا آزادانہ استعمال، شرم وحیا کی ساری حدوں کو توڑ رہا ہے، جوان لڑکوں سے لے کر کمسن بچوں تک فحاشی کے سیلاب میں بہتے چلے جارہے ہیں، چھوٹے چھوٹے بچے سیل فون کے عادی ہوچکے ہیں، جوان رات رات بھر اپنے موبائل پر دنیا بھر کی غلاظتوں میں غوطہ زن رہتے ہیں، سیل فون کا فتنہ کالجوں میں زیر تعلیم مسلمان بچیوں کی نہ صرف چادر عصمت کو تار تار کررہا ہے، بلکہ انھیں دین وایمان کی متاع عزیز سے بھی محروم کررہا ہے۔

تعلیم یافتہ مسلم لڑکیوں کے غیر مسلم نوجوانوں کے ساتھ شادی رچانے کے واقعات تھمنے کا نام نہیں لے رہے ہیں، شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہو جس میں کسی نہ کسی مسلم لڑکی کے اپنے غیر مسلم دوست کے ساتھ فرار ہونے کا سانحہ نہ پیش آتا ہو، علاوہ ازیں موبائل پر ویڈیو گیمز کی مشغولی ایک لت کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے، مار دھاڑ اور تشدد پر ابھارنے والے ویڈیو گیمز کی نئی نسل اس قدر عادی ہوتی جارہی ہے کہ کسی لمحہ خود کو اس سے دور رکھنا نہیں چاہتی، حتی کہ گھر کے بڑوں کے منع کرنے پر ان کے ساتھ تشدد پر اتر آرہی ہے۔

ابھی گزشتہ دنوں پیش آئے ایک تازہ واقعہ نے سب کے ہوش اُڑا دیے، کرناٹک کے بیلگام ضلع میں ایک بیٹے نے پب جی گیم کھیلنے سے منع کرنے پر بوڑھے باپ کے تین ٹکڑے کرڈالے، پب جی اب تک دسیوں جوانوں کی جان لے چکا ہے، بیل گام ضلع کے کاکاتی گاؤں میں پب جی گیم کھیلنے سے منع کرنے پر ایک بدنصیب بیٹے نے اپنے ساٹھ سالہ باپ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، بیشتر ویڈیو گیمز پر تشدد اور قتل وخوں ریزی کے مظہر ہوتے ہیں، اس قسم کے گیمز نئی نسل میں تیزی

کے ساتھ مقبول ہوتے جارہے ہیں، ایسے گیموں کے عادی نوجوان اپنے روشن مستقبل سے بے خبر ہوکر زندگی کے قیمتی لمحات کو ضائع کرتے نہیں تھکتے۔

جہاں تک وضع قطع اور لباس و پوشاک کی بات ہے تو اس حوالہ سے ہمارے نوجوان ساری حدوں کو پار کرتے جارہے ہیں، اسلامی وضع قطع سے بیزاری اور دشمنان اسلام کی نقالی فیشن کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے، جب کہ اسلام ایک مستقل دین اور مکمل تہذیب ہے، اس کا اپنا طرز معاشرت اور لباس و وضع قطع کا اپنا نظام ہے، جو سب سے پاکیزہ اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہے، اسلام کسی مسلمان کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ وضع قطع میں دیگر شیطانی تہذیبوں کی نقالی کرے، ہمارے نوجوان سر کے بالوں کی تراش خراش سے لے کر لباس و پوشاک تک ہر معاملہ میں اسلامی وضع قطع چھوڑ کر حیاباختہ تہذیب کو گلے لگا رہے ہیں۔

ڈاڑھی خالص مذہبی شے ہے، لیکن ہمارے نوجوان ڈاڑھی کو بھی بطور فیشن اختیار کر رہے ہیں، کوئی فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھ رہا ہے، تو کوئی مسائدلاکس ڈاڑھی، جب کبھی کوئی نئی فلم ریلیز ہوتی ہے اور اس میں اداکار جس انداز کی ڈاڑھی یا بال رکھے ہوتے ہیں بس وہی فیشن بن جاتا ہے، اس وقت نوجوانوں میں عجیب ہیئر اسٹائلس دیکھنے کو مل رہے ہیں، مشروم کٹ (Mashroom Cut) سولجر کٹ (Soldir Cut) اسٹیپ کٹ (Step Cut) ہپی کٹ (Hippy Cut) بے بی کٹ (Baby Cut) راؤنڈ کٹ (Round Cut) اسی طرح کٹورہ کٹنگ کا رواج بھی بہت عام ہے، نوجوان کٹنگ کے نام پر عجیب عجیب تماشے کر رہے ہیں، سر کے نچلے حصہ کے بال بالکل باریک اور اوپری حصہ کو بالکل چھوڑ دیا جارہا ہے، بعض نوجوان سروں پر ڈیزائن بھی بنوا رہے ہیں، جدھر دیکھیے نوجوان اپنے سروں کو تماشہ بنائے ہوئے ہیں، جب کہ یہ ساری شکلیں شرعاً درست نہیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے کچھ بال کاٹنے اور کچھ چھوڑے رکھنے سے منع فرمایا ہے، چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قزع سے منع فرمایا ہے۔ (سنن ابی داؤد) اور قزع اس کو کہتے ہیں کہ سر کے بعض حصہ کے بال کاٹے جائیں اور کچھ حصے کے چھوڑ دیے جائیں۔

اسی طرح نوجوانوں میں اپنے بالوں کو مختلف رنگوں سے رنگنے کا رواج بھی بڑھ رہا ہے، نیز خواتین اور لڑکیاں بھی بطور فیشن اپنے بال کٹوا، یا چھوٹے کروا رہی ہیں، خواہ سامنے سے ہو یا دائیں بائیں یا پیچھے کی جانب سے، اسی طرح بعض نوجوان لڑکے، لڑکیوں سے مشابہت پیدا کرنے کے لیے سر پر چوٹی کی طرح بال رکھ رہے ہیں، جب کہ کچھ لڑکیاں اپنے بالوں کو کم کر کے لڑکوں سے مشابہت کی کوشش کر رہی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لباس اور وضع قطع میں مردوں کو عورتوں سے اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، ارشاد نبوی ہے: اللہ کی لعنت ہے ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور ان

عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔(بخاری شریف)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو سر منڈانے سے منع فرمایا ہے۔(نسائی شریف)

عورتوں کو سر منڈانے کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ عورتوں کی زلفیں، مردوں کی ڈاڑھی کی طرح ہیں، صورت وزینت میں جس طرح مردوں کے لیے ڈاڑھی منڈانا، یا ایک مشت سے کم کرنا ممنوع ہے، اسی طرح عورتوں کے سر کے بال کٹوانا شرعاً ممنوع ہے۔

کالج میں زیر تعلیم مسلمان بچیاں بری طرح سے تہذیبی ارتداد کا شکار ہو رہی ہیں اور اسلامی تہذیب سے کنارہ کش ہو کر مغربی طور وطریقوں کو گلے لگا رہی ہیں، گھروں سے برقعہ پہن کر نکلا جاتا ہے، جب کہ برقعہ کے اندر جینز پینٹ اور ٹی شرٹ ہوتا ہے، کالج پہنچ کر برقعہ لپیٹ دیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ لباس آدمی پر اپنا اثر چھوڑتا ہے، کالج کے مخلوط ماحول میں مسلم لڑکیوں کا یہ طرز عمل انھیں تباہی کے دہانے پر پہنچا رہا ہے، بہت سی بچیاں اپنی بھوؤں کو خوب صورت بنانے کے لیے آئی برو کے ذریعہ آس پاس کے بال تراش کر بھوؤں کو کمان کی طرح باریک کرتی ہیں، ابرو نوچ یا تراش کر باریک سی لکیر بنالینا یا دونوں بھوؤں کے درمیان فاصلہ پیدا کرنا خلقت خداوندی میں تبدیلی پیدا کرنا ہے، جو شرعاً درست نہیں۔

بہت سی لڑکیوں میں وِگ یعنی مصنوعی بالوں کی ٹوپی لگانے کا بھی رواج بڑھ رہا ہے، اس طرح کی ٹوپیاں بعض عارضی ہوتی ہیں اور بعض دائمی، حدیث شریف کی رو سے دونوں ممنوع ہیں۔

حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔(بخاری شریف)

جسم پر ٹیٹو بنوانے کا رواج بھی مسلم لڑکوں اور لڑکیوں میں خوب عام ہو رہا ہے، کوئی جسم پر پھول وغیرہ کا ڈیزائن بنواتا ہے، تو کوئی جان دار کی تصویر بناتا ہے، گال اور ہونٹ پر مصنوعی تل بنانے کا رواج بھی ہمارے نوجوانوں میں خوب عام ہو رہا ہے، آرٹیفیشل میل داغ دے کر تل بنائے جاتے ہیں، یا سوئی سے سوراخ کر کے سرمہ یا نیل وغیرہ بھر دیا جاتا ہے۔

یہ سب تغیر خلق اللہ ہے اور ممنوع ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ گودنے والیوں اور گدوانے والیوں، بالوں کو نوچنے والیوں اور نچوانے والیوں اور خوب صورتی کے لیے دانتوں کو کشادہ کرنے والیوں اور اللہ کی خلقت میں تبدیلی کرنے والیوں پر اللہ کی لعنت ہے۔(فتح الباری)

بہت سے جوانوں کو دیکھا جا رہا ہے کہ وہ شوقیہ اپنے ہاتھوں میں لوہے یا دوسری دھاتوں کا کڑا، کالا دھاگا، یا زنجیز کے بند پہننے لگے ہیں، ہاتھوں میں کڑا یا گلے میں لاکٹ پہنا از قبیل زیورات ہے اور اس کا استعمال مردوں کے لیے درست نہیں۔

ملت اسلامیہ کو درپیش ایک اہم مسئلہ نسل نو میں منشیات کا بڑھتا رجحان ہے، کسی بھی ملت کو ترقی کی منزلوں پر لے

جانے کے لیے اصل اثاثہ نوجوان ہوتے ہیں، لیکن یہ ملت کا عظیم سرمایہ منشیات کی بھینٹ چڑھ رہا ہے، اس وقت ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ اگر کسی چیز کا خطرہ نوجوانوں پر منڈلا رہا ہے تو وہ منشیات اور نشیلی اشیاء ہیں، تعلیمی اداروں میں منشیات کا استعمال اب ایک فیشن بنتا جارہا ہے، منشیات کے عادی صرف نوجوان لڑکے ہی نہیں ہیں، بلکہ عصری اداروں میں زیر تعلیم بچیوں کی بڑی تعداد بھی اس لت کا شکار ہے۔

چند ماہ قبل اخبارات نے حیدرآباد کے ان اسکولوں کی نشان دہی کی تھی جہاں طلبہ کثرت سے منشیات کا استعمال کرتے ہیں، نوجوانوں میں تمباکو، چرس، گانجہ، افیون، شراب اور جدید قسم کی منشیات عام ہیں، افسوس ہے کہ جن اداروں میں مستقبل کے معمار تیار ہوتے ہیں اور جہاں ملک کا روشن مستقبل پروان چڑھتا ہے، اب وہاں منشیات نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، نوجوان جس تیزی کے ساتھ نشیلی اشیاء کی طرف مائل ہورہے ہیں، اس رجحان سے جہاں ہمارے نوجوانوں کی صحت پر انتہائی مہلک اثرات مرتب ہورہے ہیں، وہیں ان کی پڑھنے لکھنے اور کام کرنے کی صلاحیت بھی متاثر ہورہی ہے۔

اقوام متحدہ کے عالمی ادارہ صحت کی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں 37/کروڑ سے زائد افراد مختلف اقسام کی منشیات استعمال کررہے ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے، عالمی ادارے صحت کے مطابق ہر سال 40/لاکھ افراد منشیات کے استعمال کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، اس صورت حال کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ وبا تعلیمی اداروں کو تیزی کے ساتھ اپنی لپیٹ میں لیتی جارہی ہے۔

دہلی کے اسکولوں کے سروے کے مطابق دس سال سے لے کر 14/سال کے تقریباً 16/فیصد سے زائد بچے کسی نہ کسی نشے کا باضابطہ طور پر استعمال کرتے ہیں، تازہ ترین خبروں کے مطابق راجیہ سبھا میں سماجی انصاف کے وزیر نے یہ قبول کیا کہ نئی نسل میں نشہ کے استعمال کی بڑھتی ہوئی چلن سے سرکار فکرمند ہے اور اس نے ملک کے 195/اضلاع میں دس سال کی عمر سے لے کر 65/سال کی عمر کے لوگوں میں نشیلی اشیاء کے استعمال کے سلسلے میں سروے کروانے کا فیصلہ کیا ہے، تاکہ اسے روکنے کے لیے سرکار کوئی معقول لائحہ عمل بنا سکے، ایک بین الاقوامی سروے کے مطابق پنجاب میں 22/فیصد، ہریانہ میں 16/فیصد اور دہلی میں 24/فیصد نوجوان نشے کا شکار ہیں، نشے کی لت سے بچوں کی صحت اور تعلیم دونوں متاثر ہو رہے ہیں، حیدرآباد اور اس جیسے بڑے شہروں میں حقہ پارلر کا سلسلہ بھی خوب پنپ رہا ہے، جس میں لڑکے اور لڑکیاں مخلوط ماحول میں بے حیائی کا خوب مظاہرہ کرتے ہیں۔

فضول خرچی کی حقیقت

اور کفایت شعاری کی اہمیت

مولوی محمد عادل ارریاوی

آج ہم سب مہنگائی کا شکوہ کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ ایک حقیقت بھی ہے، لیکن ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ خود ہمارے اپنے رویّے بھی اس مہنگائی کو مزید بڑھا دیتے ہیں، ہم بہت سی جگہوں پر ایسے خرچے کرتے ہیں جن کا نہ کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی ضرورت اور پھر آخر میں پریشانی ہمارے ہاتھ لگتی ہے۔ آج کل ہر طرف مہنگائی اور بے روزگاری کا رونا رویا جاتا ہے، آئے دن مہنگائی کے خلاف احتجاج کیے جاتے ہیں اور ریلیاں نکالی جاتی ہیں اور میڈیا پر طرح طرح سے شکوے شکایات کیے جاتے ہیں، گویا کہ ایک طرح سے ہائے مہنگائی اور ہائے مہنگائی کا وظیفہ پڑھا جاتا ہے اور اس وظیفے میں غریب لوگوں کے علاوہ امیروں اور مال داروں کا بڑا طبقہ بھی شامل ہوتا ہے۔ لیکن اسلام نے اس سلسلے میں جو اہم تعلیم دی ہیں، اس کی طرف عام طور پر توجہ نہیں کی جاتی، جو معاشی مسائل کو بہتر بنانے کے لیے ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسراف، فضول خرچیوں اور بے جا مال اڑانے سے اجتناب کیا جائے اور کفایت شعاری کے اصول پر عمل پیرا ہوا جائے۔ زندگی میں بے ترتیبی اصل مسئلہ ہے۔ اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:

"وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا" (الفرقان: ٦٧)

(اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ وہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ اُن کا طریقہ درمیانِ اعتدال کا طریقہ ہے۔) یعنی اللہ کے مقبول بندے مال خرچ کرنے کے وقت نہ اسراف اور فضول خرچی کرتے ہیں، نہ بخل و کوتاہی، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ آیت میں اسراف اور اس کے بالمقابل اعتبار کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

اسراف کے لغوی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، اصطلاح شرع میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت مجاہدؒ، قتادہؒ، ابن جریجؒ کے نزدیک اللہ کی معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے۔ اگرچہ ایک پیسہ ہی ہو اور بعض حضرات نے فرمایا جائز اور مباح کاموں میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا جو تبذیر یعنی فضول خرچی کی حد میں داخل ہو جائے، وہ بھی اسراف کے حکم میں ہے، کیونکہ تبذیر یعنی فضول خرچی قرآنی تعلیمات کے اعتبار سے میں حرام و معصیت ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ" (بنی اسرائیل: ٢٧)

اس لحاظ سے اس تفسیر کا حاصل بھی حضرت ابن عباس وغیرہ کی مذکورہ تفسیر کے مطابق ہو گیا، یعنی معصیت و گناہ میں

جو کچھ خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے۔(مظہری)

اور ''اقتار'' کے معنے خرچ میں تنگی اور بخل کرنے کے ہیں۔اصطلاح شرع میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جن کاموں میں اللہ ورسول نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اُن میں خرچ کرنے میں تنگی برتنا،(اور بالکل خرچ نہ کرنا بدرجہ اولی اس میں داخل ہے)۔یہ تفسیر بھی حضرت ابن عباسؓ قتادہؒ وغیرہ سے منقول ہے۔(مظہری) مذکورہ آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ ایمان والوں کی صفات میں سے ایک اہم صفت یہ ہے کہ وہ اپنے مال کو افراط وتفریط کا شکار ہوئے بغیر اعتدل کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ قَصْدُهُ فِي مَعِيشَتِهِ''یعنی انسان کی دانشمندی کی علامت یہ ہے کہ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرے(نہ اسراف میں مبتلا ہو نہ بخل میں)۔(رواہ احمد عن ابی الدرداء، وابن الاثیر)

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''مَا عَالَ مَنِ اقتصد''یعنی جو شخص خرچ میں میانہ روی اور اعتدال پر قائم رہتا ہے وہ کبھی فقیر ومحتاج نہیں ہوتا۔(رواہ احمد، بحوالہ معارف القرآن از مفتی محمد شفیع عثمانی، جلد:۶/صفحہ:۶۳۰)

آج کے دور میں ایک عام آدمی کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ کمانے کے بعد رقم کہاں خرچ ہوئی یہ نہیں جانتا، وہ اپنی آمدنی کے مطابق جینے کے بجائے دوسروں کی دیکھا دیکھی چلتا ہے اور سوشل میڈیا نے بھی مقابلے کی آگ کو تیز کر دیا ہے۔یہ سب چیزیں مل کر غربت اور دل کی بے چینی کو اور بڑھا دیتی ہیں۔آج کے دور میں لوگوں نے فضول خرچیوں اور بے جا، بلکہ شاہی اخراجات کے بڑے بڑے پھاٹک کھول رکھے ہیں، بچہ کی پیدائش سے لے کر شادی بیاہ اور وفات تک بے شمار فضول رسموں میں لوگوں نے اپنے آپ کو گھیر رکھا ہے اور روزمرہ کی فضول خرچیوں کا معاملہ الگ ہے۔

اگر ہم صبح سے شام تک اپنے ہونے والے اخراجات پر انصاف کی نظر ڈالیں گے اور گہرائی سے جائزہ لیں گے تو ہمیں اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے زیادہ دشواری کا سامنا نہیں ہوگا کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہونے والے اخراجات میں کمی اور کنٹرول کر کے اپنی معاشی بدحالی کا کافی حد تک ازالہ کر سکتے ہیں، کھانے، پینے، پہننے اوڑھنے، برتنے اور استعمال کرنے کی تمام چیزوں کا جائزہ لے کر ہم اپنے اخراجات کو کافی حد تک کم کر سکتے ہیں اور معاشی بدحالی کا رونا رونے سے جان چھڑا سکتے ہیں۔دکھاوا وہ مرض ہے جو سب کو تنگ کر رہا ہے، اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو خوش کرنا ممکن نہیں، لیکن خود کو برباد کرنا بہت آسان ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ غریب سے غریب لوگ بھی چائے وسگریٹ نوشی مختلف قسم کے غیر ضروری بلکہ مضر مشروبات، اخبار بینی اور اس جیسی کئی قسم کی چیزوں میں روزانہ کے حساب سے سینکڑوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔بجلی پانی اور گیس اور پٹرول کا غیر ضروری استعمال کر کے ہر مہینہ ہزاروں روپے کا بل اپنے کھاتے میں جمع کرانے کا بوجھ اپنے اوپر

لادتے ہیں۔

بلاوجہ ٹیلی فون اور موبائل وغیرہ کا استعمال کر کے سینکڑوں اور ہزاروں روپوں کے بل بھرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، بچہ کی پیدائش، شادی بیاہ اور فوتگی کے عنوان سے کئی رسموں میں ہزاروں نہیں لاکھوں روپے برباد کرتے ہیں، صرف نمود و نمائش اور ریاکاری کے طور پر قیمتی ونمائشی لباس اور کپڑوں پر بھاری رقم قربان کردیتے ہیں۔ اگر ہم بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت کے اصول پر عمل پیرا ہوں اور روزمرہ کی زندگی میں اس کا اہتمام کریں تو یقیناً ہم میں سے ہر ایک شخص سینکڑوں اور ہزاروں روپے کے اخراجات میں کمی کرسکتا ہے۔ کفایت شعاری کا مطلب کنجوسی نہیں، کفایت شعاری کا مطلب ہے جتنا ضروری ہے، اُتنا خرچ کرو، جتنا مل گیا ہے، اُس پر شکر کرو، جو نہیں ہے اُس کی لالچ میں اپنی سکون نہ بیچو، یہی وہ اصول ہے جو ہمیں مہنگائی کے دور میں تھام کر رکھ سکتا ہے۔

اپنے دل کو بدلنے کی ضرورت: مہنگائی کے دور میں سب سے پہلی تبدیلی سوچ میں لانا ضروری ہے، کم میں جینا سیکھو، اپنی کمائی کا حساب رکھو، لوازمات اور خواہشات میں فرق کرو، اپنے مقابلے میں ہمیشہ اُن لوگوں کو دیکھو جن کے پاس کم ہے، تب ہی دل مطمئن ہوگا اور زندگی آسان لگے گی۔ اسی کے ساتھ ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو حلال اور جائز طریقہ پر جتنا کچھ دیا ہے وہ اس پر صبر وشکر اور قناعت کرے، اور اپنے سے اوپر اور مال دار لوگوں پر نظر رکھنے کے بجائے، اپنے سے کم تر اور غریب لوگوں پر نظر رکھے۔ اگر ہم نیک نیتی اور دُھن ودھیان کے ساتھ ان دونوں کاموں کو اختیار کرلیں گے، یعنی فضول خرچیوں سے اجتناب اور کفایت شعاری کا اہتمام کرلیں گے، تو امید ہے کہ مہنگائی اور بے روزگاری کا رونا رونے سے، مقروض ہونے سے، دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے، بلکہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے لوٹ مار حرام خوری اور قتل وغارت گری کے کئی سنگین جرائم سے، بھی بآسانی نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ مہنگائی کم ہو یا زیادہ ہمارے اپنے رویّے اگر درست ہوجائیں تو زندگی آسان ہوجاتی ہے، اگر ہم فضول خرچی کم کردیں، دکھاوا چھوڑ دیں اور گھر کے نظام میں تھوڑی سی ترتیب لے آئیں، تو یقین جانیے گھریلو جھگڑے کم ہوں گے، ذہنی سکون بڑھے گا، قرضوں سے نجات ملے گی اور زندگی میں برکت آئے گی۔ اللہ کرے ہم سب سمجھ جائیں کہ بہتر زندگی پیسے سے نہیں سمجھ داری سے بنتی ہے۔

اللہ ربّ العزت ہم سب کو فضول خرچی نجات عطا فرمائے، حرام کمائی سے مکمل حفاظت فرمائے، حلال رزق عطا فرمائے، آمین ثم آمین یارب العالمین۔

یادرفتگاں

عارف باللّٰہ

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ پرتاپ گڑھی

قسط نمبر:۱

ابوطہ محمد صغیر پرتاپ گڑھی

شعور کے بعد گھر میں سب سے زیادہ جن عظیم شخصیتوں کا تذکرہ سنتا رہا اور جن کی صورتیں انہی ایام سے حافظہ میں نقش ہیں، ان میں سرفہرست عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہے۔ مناسب قد، ہڈیوں اور چمڑوں کا مرکب جسم، ناک نقشہ باریک، داڑھی بالکل سفید اور باریک، گورا رنگ، نورانی پیشانی، چمکتا چہرہ، ٹھنڈی میں کئی کئی گرم کرتے اور صدری، شرعی پائجامہ نصف ساق تک، طبیعت میں بے حد نفاست، چہرے پر اس قدر نورانیت اور شخصیت میں ایسی جاذبیت کہ نظر ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ بول اتنے میٹھے کہ معلوم ہو، پھول جھڑتے ہیں۔ مزاج انتہائی لطیف ،معمولی کوئی تکلیف ہوئی، تو آہ آہ بہت تکلیف ہے۔ طبیعت بہت خراب ہے، بیمار ہوں، علیل ہوں، صاحب فراش ہوں۔

آپ کے دینی اور اصلاحی کاموں کے رفیق والدی ماجدی مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار صاحب قدّس سرہٗ فرماتے تھے کہ حضرت اپنی جوانی میں اس قدر تیز رفتار تھے کہ رفقاء کو پیچھے دوڑنا پڑتا تھا اور اٹھارہ ہاتھ اکھاڑہ کود جاتے تھے۔

وطن مالوف پھولپور پرتاپ گڈھ میں جب آپ کا قیام رہتا تو برادر اکبر حضرت مولانا محمد امین صاحب قاسمی اکثر وبیشتر آپ کی خدمت میں جایا کرتے تھے اور گھر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے اکثر اس حقیر راقم السطور کو بھی سائیکل پر بٹھا کر ساتھ لے جاتے۔ رات بھر قیام کرتے صبح واپس آجاتے۔ اس وقت کی زیادہ باتیں قوت حافظہ میں محفوظ نہیں ہیں۔

ادھر حضرت کا حال یہ تھا کہ جب بھی میرے گاؤں اوگئی پور (جو آپ کے گاؤں پھولپور سے تقریباً ۷ رکلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے) کے آس پاس سے گزر ہوتا، تو ضرور والد محترم عالم ربانی حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قدیم دوستانہ روابط ومراسم کی بنا پر غریب خانے پر تشریف لاتے، یا کوئی تقریب ہوتی تو والد صاحبؒ دعوت دیکر بلاتے۔ آپ کی آمد پر ضیافت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا، اس دن عید کا سماں ہوتا، والدہ محترمہ (جو حضرت سے بیعت بھی تھیں) قسم قسم کے کھانے تیار کرتیں اور ہم بچوں کے مزے آجاتے۔

ولادت باسعادت

آپ کی ولادت باسعادت ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں موضع پھولپور میں ہوئی۔ یہ موضع شہر پرتاپ گڈھ، یوپی ، سے جانب مغرب ۲۱ رکلومیٹر کے فاصلے پر اور اورشمشیر گنج بازار سے تقریباً ۱ رکلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ والد محترم کا نام نامی اسم گرامی جناب غلام محمد صاحب تھا۔ جو سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود آپ انتہائی نیک و پارسا انسان تھے۔ اویس زمانہ حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور برابر حضرت کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔ ابتدا میں ان کے یہاں صرف چھ صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ ایک مرتبہ حضرت گنج مرادآبادی سے نرینہ اولاد کے لئے دعاء کی درخواست کی، تو حضرت نے فرمایا ''دعاء کروں گا'' انشاء اللہ بیٹا پیدا ہوگا، اس کا نام ''احمد'' رکھنا۔ ۱۳۱۳ھ میں حضرت گنج مرادآبادی رحلت فرما گئے، اس کے بعد اس دعاء کی قبولیت کے ظہور کا وقت آیا اور ۱۳۱۷ھ میں غلام محمد صاحبؒ کے یہاں لڑکا تولد ہوا۔ حضرت کے حکم کے مطابق ''محمد احمد'' نام رکھا گیا؛ جو بعد میں چل کر شیخ وقت اور قطب دوراں ہوا۔

نرینہ اولاد میں اکلوتے تھے۔ اس لئے بڑے ناز و انداز اور لاڈ و پیار سے آپ کی پرورش ہو رہی تھی۔ مگر اللہ ربّ العزت کو کچھ اور ہی منظور تھا، مستقبل میں اس بچے سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں لینے تھیں، مجاہدے کروانے تھے، اگر ناز و نعمت میں پلتا تو مجاہدے کیسے کرسکتا۔ مشیت ایزدی نے ۴ رمئی ۱۹۱۴ء کو سایۂ پدری سے محروم کردیا اور اس کے چند ہی دن بعد شفقت مادری سے بھی۔ والدین کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش ننہال میں ہوئی۔

تعلیم و تربیت

ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل فرمائی۔ باقی درسیات کی تکمیل اور فارسی و عربی کی تعلیم اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا سیّد بدر علی شاہ ازہری علیہ الرحمۃ کی خدمت میں رہ کر حاصل کی اور انہی سے اجازت حدیث حاصل کی۔ حضرت مولانا سیّد بدر علی شاہ صاحبؒ جہاں جامعہ ازہر سے فارغ تھے، وہیں حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی سے بھی حدیث پڑھی تھی اور اجازت حاصل کی تھی۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان صاحبؒ نے حدیث شریف شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے پڑھی تھی۔ اس طور پر حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو علم حدیث میں بھی اپنے زمانے کی انتہائی ارفع و عالی سند حاصل تھی ۔مگر فنا و نیستی کا غلبہ اس قدر تھا کہ اپنی شان علمی کا کبھی اظہار تک نہیں فرماتے تھے۔ (تذکرہ مولانا محمد احمد صاحب: از عمار احمد)

بیعت و خلافت

اپنے زمانے کے تمام ہی بزرگوں سے استفادہ کیا اور سب کی خدمت میں حاضری دی، خانقاہ ''تھانہ بھون'' بھی تشریف لے گئے اور حضرت حکیم الامّت کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ فرماتے تھے کہ حضرت نے خاص توجہ فرمائی اور

مجلس میں خاص جگہ پر بیٹھنے کا حکم فرمایا۔کئی روز قیام کیا اور حضرت سے فیض حاصل کیا۔حضرت نے نہایت شفقت کا معاملہ فرمایا۔

البتہ باضابطہ بیعت کا تعلق اولاً حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحب ''کوڑا جہاں آبادی'' قدس سرہٗ سے قائم فرمایا۔تقریباً چار سال کا عرصہ حضرت کی خدمت میں گزارا اور حضرت نے اجازت سے مشرف فرمایا۔(ایضاً:۱۸)

حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحب

حضرت شاہ وارث حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بابت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:''مولانا شاہ وارث حسن صاحبؒ کا قیام شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلہ پر رہتا تھا، وہ ہمارے شہر لکھنؤ کے کثیر التعداد وکلاء اعلیٰ عہدے داران اور صاحب وجاہت لوگوں کے پیر ومرشد تھے،ان کے ذریعہ اس طبقہ میں بڑی اصلاح ہوئی اور دینداری پیدا ہوئی۔ان کو بیعت حضرت گنگوہی سے تھی اور اجازت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے۔ (کاروان زندگی جلد اول: ۴۴۵)

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ،حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحبؒ کے بعد،حضرت مولانا سید بدر علی شاہ صاحب نور اللہ علیہ مرقدہٗ کی خدمت میں ''سدھونہ''،ضلع رائے بریلی حاضر ہوئے اور تجدید بیعت کی، پھر یہیں کے ہو رہے۔ حضرت ہی سے درسیات کی تکمیل فرمائی اور اسی کے ساتھ نسبت نقشبندیہ مجددیہ سے سرفراز ہوئے۔مولانا بدر علی صاحبؒ نے بھی خلافت واجازت سے مشرف فرمایا۔اس طور پر چشتیہ ونقشبندیہ دونوں سلسلوں سے آپ نے اکتساب فیض کیا اور دونوں مشائخ نے چاروں سلسلوں میں بیعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔چنانچہ آپ اپنے متوسلین کو دونوں سلسلوں کے معمولات کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

مولانا بدر علی صاحبؒ

حضرت مولانا بدر علی شاہ صاحبؒ کا آبائی وطن ''میر پور''ضلع الٰہ آباد تھا اور نانہال موضع ''موئی''،متصل قصبہ جائس ضلع رائے بریلی (یوپی)۔آپ کی ولادت ماہ شوال ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء میں ہوئی۔ابتداء میں آپ کا قیام نانہال ہی میں تھا۔اس کے بعد ضلع رائے بریلی کے تین مواضعات ''شیخن گاؤں، بہو'' اور ''سدھونہ'' میں بھی سکونت اختیار فرمائی۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ کو تپ دق کا مرض ہو گیا اور اس درجے میں پہنچ گیا کہ لاعلاج ہو گیا اور جسم ضعف کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا۔اتفاقاً حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سیاحی کرتے ہوئے آپ کے نانہال موضع ''موئی'' پہونچ گئے۔آپ کی والدہ نے عرض کیا کہ:حضرت! شہر میں قیام فرمائیں،اس لئے کہ یہاں میری حالت بڑی بے کسی کی ہے۔حضرت نے فرمایا:اسی غرض سے آیا ہوں،تمہارا لڑکا صحت یاب ہو کر عرصہ دراز تک زندہ

رہے گا۔حضرت کی دعاء نے تریاق کا کام کیااور آپ روبصحت ہو گئے۔صحت یابی کے بعد حضرت گنج مرادآبادی کی خدمت میں جا کر شرف بیعت حاصل کی اور تحصیل علم کے لئے جامع ازہر جانے کی اجازت طلب کی۔حضرت نے فرمایا: جاؤ! لیکن جیسے جاتے ہو، ویسے ہی واپس آنا، شادی نہ کر لینا۔

چنانچہ آپ قاہرہ تشریف لے گئے اور ۱۷ سال کے بعد جامع ازہر سے فارغ ہو کر ۱۸۶۹ء میں واپس آئے۔یہ وہی سال تھا، جس سال نہر سوئز کھودی گئی تھی۔ہندوستان واپس آ کر حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان گنج مرادآبادیؒ سے دوبارہ مشرف بہ بیعت ہوئے اور حضرت کی طرف سے خلافت سے نوازے گئے۔پھر حضرت نے اپنی وفات سے پہلے دوبارہ خلافت واجازت مرحمت فرمائی۔

آپ نے علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ جامع ازہر میں طب جالینوس کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔اس لئے موضع ''پتھونہ'' ضلع رائے بریلی میں ایک عرصہ تک مطب بھی کیا۔آپ صاحب کشف وکرامت، انتہائی قانع اور زاہد بزرگ تھے۔ذریعہ معاش کھیتی اختیار کر رکھا تھا، تھوڑی سی زمین تھی۔خود ہی جوتتے بوتے تھے اور اللہ رب العزت اس میں خوب برکت دیتا، قرب وجوار کے رؤساء بے حد معتقد تھے۔انھوں نے بطور جاگیر کثیر رقبہ آراضی نذر کرنی چاہی؛ مگر آپ نے قبول نہیں کیا۔ایک سال عام قحط پڑا، کسی کی زمین میں کچھ نہیں پیدا ہوا، مگر آپ کی زمین میں ۱۸ من گیہوں پیدا ہوا۔آپ کے پاس مرغیاں، بکریاں اور بھینسیں بھی تھیں اور سب کو چھوڑ کر بوئی ہوئی فصل چراتے تھے۔لوگ کہتے کہ حضرت یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرماتے کہ ان کی روزی بھی اسی میں ہے۔جو لباس زیب تن رہتا، اس کے علاوہ دوسرا جوڑا نہ رکھتے تھے، کبھی دسترخوان پر دو سالن جمع نہ ہونے دیا۔دیہاتی زبان بولتے تھے اور ظاہری وضع وقطع ایسی اختیار کر رکھی تھی کہ کوئی دیکھ کر عالم بھی نہیں سمجھتا تھا۔

جناتوں کو بھی آپ سے تعلق تھا۔حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں مقیم رہا، چند روز کے بعد رخصت ہونے کی اجازت طلب کی، تو فرمایا! ابھی رُکئے؛ میں رُک گیا۔بعد عصر برائے تفریح میدان کی طرف نکلے، میں پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور کھلی آنکھوں دیکھ رہا تھا کہ حضرت کے دست مبارک میں کوئی کتاب وغیرہ نہیں ہے۔یکا یک دیکھا کہ ''ابوداؤد شریف'' کے دو نسخے آپ کے ہاتھ میں موجود ہیں۔میں متحیر ہو گیا کہ یہ کہاں سے آ گئے؟ خود ہی شاہ صاحبؒ نے فرمایا! یہ کتاب ''ابوداؤد شریف'' یہاں نہیں ملتی، آپ کے بھائی ''جن'' کو پیسہ دے کر لانے بھیجا تھا، وہ ابھی لیکر آیا، آپ ایک نسخہ لے لیں، اسی لئے آپ کو روکا تھا، اب آپ جا سکتے ہیں۔مولانا محمد احمد صاحبؒ فرماتے تھے کہ ابوداؤد کا وہ نسخہ آج بھی میرے پاس ہے۔نیز حضرت مولانا عمار صاحب الہ آبادی نے ''تذکرہ مولانا محمد احمد صاحبؒ'' میں لکھا ہے کہ آپ کو بخاری شریف مکمل حفظ تھی۔

آپ جہاد طرابلس میں بھی شریک ہوئی تھے۔چنانچہ خود فرماتے تھے کہ مجھے جہاد میں شریک ہونے کی سعادت

نصیب ہوئی۔ میں ۱۹۱۰ء کے جہاد طرابلس میں شریک تھا۔ ایک گولہ میرے ہاتھ پر گرا تھا، اس کا نشان اب تک موجود ہے۔ اس عالم ربّانی اور مردمجاہد نے ۲۳ رشعبان ۱۳۵۴ھ بروز جمعرات بعمر ایک سوسولہ سال، اس عالم فانی سے کوچ کیا۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔ (اقوال سلف: ۴۰۹/۴)

اخلاق و کردار

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا سب سے امتیازی وصف خوش خلقی، شفقت و محبت کا برتاؤ، علماء اولیاء اور طلبہ کرام کا اعزاز و اکرام کرنا تھا۔ آپ اخلاق حسنہ کے پیکر تھے، جو بھی ملتا پہلی ہی دفعہ میں گرویدہ ہوجاتا۔ سادہ طبیعت، پاک طینت اور کریم النفس تھے۔ عفو و درگزر، بخشش و عطا، حلم و بردباری، ریاکاری و دکھاوے سے اجتناب، عجب و نخوت سے احتراز، مجاہدانہ زندگی، استقلال و استقامت، مال و منال سے بے رغبتی، طلب جاہ و شہرت سے بے نیازی، قناعت پسندی، غمگساری، ایثار و ہمدردی، تدبر و حکمت اور دوراندیشی، فتنہ و فساد سے دوری، اختلاف و انتشار سے کنارہ کشی، اسلاف کا ادب و احترام، اخلاف پر شفقت، اہل علم سے محبت، بغض و عداوت، حسد و کینہ جیسے ناپاک جذبات سے پاک۔

الغرض اعلیٰ اوصاف اور مومنانہ کردار سے متصف تھے۔ آپ کی پوری زندگی علم و عمل، تقویٰ و دیانت اور قول و فعل کی جامعیت کی بے مثال اور قابل رشک زندگی تھی۔ سلف صالحین کا جیتا جاگتا نمونہ اور تصویر تھے۔ ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ جو بھی قریب آتا، یہی تصور لے کر جاتا کہ حضرت مجھ سے بے پناہ تعلق رکھتے ہیں۔ ہر آنے والے کی خبر گیری اور ہر ایک کی نگہہ داشت خواہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ خود اس حقیر کے ساتھ حضرت کی شفقت اور خوردنوازی کا حال یہ تھا کہ بندہ حضرت کے آخری ایّام میں مدرسہ ''بیت المعارف'' الٰہ آباد میں عربی اوّل کا طالب علم تھا اور بالکل نوعمر، والد محترم حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت کے مابین جو تعلق اور مراسم تھے، اس کی بنا پر بندہ بعد عصر روز آنہ خانقاہ میں حاضر ہوتا، خواہ کتنی عظیم شخصیتیں موجود ہوتیں، خانقاہ بھری ہوتی، جیسے ہی اس حقیر پر حضرت کی نظر پڑتی۔ خادم کو حکم فرماتے کہ میرا بچہ آیا ہے، اسے ''پاپا'' دیدو۔ (واضح رہے کہ آپ کا معمول تھا کہ جو حضرات بھی آپ سے ملنے آتے، انہیں بطور تبرک پاپا عنایت فرماتے) اور اگر مجلس خالی رہتی تو پاس بٹھا لیتے، والد محترم کی خیریت دریافت کرتے، اس کے بعد رخصت کرتے۔

آپ کے اخلاق و کردار کی بابت محدّث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی دامت برکاتہم کا وجود وقت کے مغتنمات میں سے ہے، صلاح و تقویٰ، زہد و اخلاص اور اصلاح و تذکیر میں بہت اونچا مقام رکھنے کے باوجود سادگی اور انکساری و تواضع میں ان کی کوئی مثال نہیں۔ ان کے یہاں بعض مشائخ کے رسوم اور شان و شوکت کے قسم کی چیز کا وجود نہیں ہے۔'' (روح البیان: ۱۰/۲)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہٗ العالی (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) سے پوچھا کہ: سلسلۂ نقشبندیہ میں اس وقت قوی النسبۃ بزرگ کون ہیں؟ تو مفتی محمود صاحب گنگوہی مدظلہٗ العالی نے مولانا محمد احمد صاحب مدظلہم ہی کا نام لیا۔

''(الٰہ آباد سفر کے دوران) احقر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو لمحات آپ کی صحبت میں نصیب ہوئے، وہ بلاشبہ زندگی کی یادگار نعمتوں میں سے تھے۔ اپنے بزرگوں کی ساری ادائیں وہاں جلوہ گر تھیں۔ وہی سادگی، وبے ساختگی، وہی تواضع، وہی عبدیت وفنائیت کا رنگ، وہی سوز وگداز۔ نہ کوئی شان وشوکت، نہ پیروں کا ساٹھ باٹھ اور مصنوعی درویشی کا تکلف، سر سے پاؤں تک مجسم شفقت ورحمت، آنے والے کو دین کی کوئی نہ کوئی بات پلانے کی لگن۔'' (جہان دیدہ: ۵۳۲)

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی بابت فرماتے تھے :

''صاحب نسبت بزرگ اور مستجاب الدعوات ہیں'' نیز آپ کا قول ہے ''میں نے ایسا متواضع اور بے نفس شیخ نہیں دیکھا''۔ (روح البیان: ۲/۲۷)

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت سے بہت عقیدت تھی۔ جب بھی موقعہ پاتے پرتاپ گڈھ یا الٰہ آباد خدمت میں حاضر ہوتے اور خوب خوب استفادہ کرتے۔ ایک موقعہ پر تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ یادگار سلف اور مشائخ کبار کا نمونہ رہ گئے ہیں، جب کبھی توفیق ہوتی ہے، انہیں کی خدمت میں حاضر ہوکر ذکر الٰہی، فکر آخرت اور تواضع واخلاص کے وہ نمونے دیکھ لیتا ہوں؛ جواب صرف کتابوں کے اندر رہ گئے ہیں۔ **اطال اللہ بقاءہٗ**۔'' (کاروان زندگی، جلد اول: ۴۴۵)

دعوتی واصلاحی سرگرمیاں

علم ظاہر کے اعتبار سے آپ اگرچہ کسی بڑے ادارے سے باقاعدہ سند یافتہ نہ تھے؛ لیکن اہل اللہ کی صحبت نے ایسا جلوہ پیدا کردیا تھا کہ بہت سے فارغین پر فائق تھے۔ اس کا اندازہ آپ کے مواعظ، کلام اور تصانیف سے ہوتا ہے۔ نسبت مع اللہ اور علم لدنی سے آراستہ وپیراستہ تھے۔ وعظ کے دوران آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور وجدانی تمثیلات وعرفانی تفصیلات اس خوش اسلوبی سے پیش فرماتے کہ لوگ حیرت میں ڈوب جاتے۔ قوم وملت کی اصلاح اور ان کی تربیت کا جذبہ پیدائشی عطا ہوا تھا؛ چنانچہ بچپن ہی سے حال یہ تھا:

''آپ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ جب کھیلنے جاتے، تو ایک جگہ ان کو جمع کرکے بجائے کھیل کود کے وعظ فرماتے تھے۔ بزرگوں کے واقعات اور عبرت ونصیحت کی باتیں ان کو سناتے۔'' (تذکرہ: ۱۷)

قوم کی اصلاح اور ان کو رسوم وبدعات سے بچانے کی ایسی لگن اللہ ربّ العزت نے دل میں پیدا کردی تھی کہ قرب وجوار کے مواضعات میں کبھی پیدل، کبھی سائیکل سے اور کبھی کسی اور سواری سے نکل جاتے، گڑ روٹی، یا نمک روٹی

ساتھ رکھ لیتے اور گاؤں گاؤں، قریہ قریہ جا کر وعظ و نصیحت کرتے اور شرک و بدعات سے اجتناب کی دعوت دیتے۔

وعظ کی خصوصیت

وعظ کا انداز علمائے سلف کے نہج پر انتہائی شگفتہ، سادہ اور بے ساختہ تھا، تکلف اور آورد کا دور دور تک شائبہ نہیں، نہ پرشکوہ الفاظ تھے، نہ خطابت کی رعنائیاں، مگر باتیں سب اصولی، عارفانہ اور حکیمانہ۔ زبوں حالیٔ ملت کا سوز و درد حرف حرف سے نمایاں، مضامین ایسے پرتاثیر کہ دل میں کھپ جائیں اور غافل انسان کے پردۂ غفلت کو تار تار کر کے اسے آخرت کی فکر کے لئے بے چین کر دیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ رقم طراز ہیں:

''ایک مرتبہ پرتاپ گڈھ کی جامع مسجد میں کسی تبلیغی دورے کے موقع پر، حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان سنا اور کانوں کو نہیں بلکہ قلب و روح کو وہ پرانا دینی ذائقہ یاد آ گیا؛ جو اللہ والوں کے بیان میں محسوس ہوتا تھا اور عرصہ سے دل اس کا جویا تھا، مگر وہ جنس اب نایاب معلوم ہوتی تھی۔'' (مقدمہ روح البیان ۲/ ۷)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی تحریر فرماتے ہیں:

''دوران وعظ آپ جو کچھ فرماتے ہیں پوری دلسوزی کے ساتھ فرماتے ہیں، اس لئے آپ کا وعظ دل میں اترتا ہے، آپ کے وعظ سے دل پسیجتے ہیں، روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور نرم دل والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ زیادہ تر کلام اللہ کی آیتوں سے استشہاد و استناد ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ باوزن اور موثّر وعظ کیا ہو سکتا ہے۔'' (مقدمہ روح البیان ۲/ ۱۰)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے وعظ کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

''اہل اللہ کا وعظ ایسا ہی ہوا کرتا ہے''۔ (مقدمہ روح البیان: ۲/ ۲۷)

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

''بلاشبہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی دامت برکاتہم کی ذات گرامی اس دور میں ہمارے اسلاف کا نمونہ ہے، جن حضرات کو آپ کی مجالس میں شرکت کرنے اور آپ کے مواعظ سننے کا اتفاق ہوا ہوگا؛ ان کو بخوبی اس کا اندازہ اور مشاہدہ ہوگا کہ آپ کی مجلس میں کیسی برکت اور آپ کے بیان میں کس قدر تاثیر ہوتی ہے۔ حرمین شریفین میں میں نے خود دیکھا کہ حضرت مولانا کے مواعظ و مجالس میں بڑے بڑے علماء و اکابر مختلف مقامات کے بڑے اہتمام سے تشریف لاتے تھے اور بہت متاثّر اور محظوظ ہوتے تھے۔ احقر کو بھی حضرت مدظلہٗ کی مجلس میں شرکت کا بارہا اتفاق ہوا، آپ کے بیانات عجیب پرتاثیر مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں۔ متقدمین جیسا سادہ انداز بیان مگر نہایت جامع اور موثر ہوتا ہے۔'' (روح البیان ۲/ ۲۹) (جاری)

فقہ وفتاوی

مفتی محمد ریحان گودھروی

سوال.....: بچوں کو فقط چہرے کی تصویر والے کپڑے پہنانا کیسا ہے؟

جواب.....: اگر کپڑوں پر بنی ہوئی تصویر اس طرح ہو کہ جس سے چہرہ کے اعضاء آنکھ، کان، ناک، منہ واضح طور پر ظاہر ہوتے ہوں، تو یہ تصویر کے حکم میں داخل ہے، حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: رحمت کے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا (جاندار کی) تصویر ہو، لہذا اس طرح کی تصویروں والے کپڑے پہنانا جائز نہیں ہے:

عن أبي طلحة قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا تصاوير. (مشكوة المصابيح)

(قوله: ولبس ثوب فيه تماثيل) عدل عن قول غيره تصاوير لما في المغرب: الصورة عام في ذي الروح وغيره، والتمثال خاص بمثال ذي الروح ويأتي أن غير ذي الروح لا يكره قال القهستاني: وفيه إشعار بأنه لا تكره صورة الرأس، وفيه خلاف كما في اتخاذها كذا في المحيط، قال في البحر: وفي الخلاصة: وتكره التصاوير على الثوب صلى فيه أو لا انتهى، وهذه الكراهة تحريمية. وظاهر كلام النووي في شرح مسلم الإجماع على تحريم تصوير الحيوان، وقال: وسواء صنعه لما يمتهن أو لغيره، فصنعته حرام بكل حال لأن فيه مضاهاة لخلق الله تعالى، وسواء كان في ثوب أو بساط أو درهم وإناء وحائط وغيرها (اه) فينبغي أن يكون حراما لا مكروها إن ثبت الإجماع أو قطعية الدليل بتواتره (اه) كلام البحر ملخصا. (شامي كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة ومايكره فيها: 647/1، ط: سعيد)

سوال.....: مسجد میں صف بچھی ہوتی ہے، مؤذن صاحب اس پر اپنا مصلیٰ بچھا کر رکھتے ہیں، کیا مؤذن یا دیگر کسی مقتدی کے لیے صف پر مصلی یا دوسرا کپڑا بچھانے کی اجازت ہے؟

جواب .....: مسجد میں کسی کا اپنے لئے جگہ کا خاص کرنا مکروہ تحریمی ہے، اور یہ حکم سب کے لئے یکساں ہے، اقامت (تکبیر کہنے) کے لیے مسجد میں کسی جگہ کی تخصیص نہیں ہے، کسی بھی صف سے اقامت کہی جاسکتی ہے، لہذا صف اول میں امام کے پیچھے موذن کے لیے جانماز وغیرہ بچھا کر جگہ مخصوص کرنے کا رواج بے اصل ہے، اس سے احتراز کیا

جائے، دوسرے لوگوں کا بھی کسی جگہ پر کپڑا بچھانے سے اس کو اپنا حق سمجھنا غلط ہے، ہاں کوئی شخص نماز کے لیے مسجد میں گیا ہو، پھر وضو وغیرہ کی ضرورت کے لیے اپنی جگہ پر کپڑا رکھ کر جانے لگے اور ضرورت سے فارغ ہوتے ہی آنے کا قصد ہے، تو واپس آنے پر اس کو اس جگہ بیٹھنے کا حق ہوگا۔ لہٰذا مؤذن صاحب جس جگہ مصلیٰ بچھاتے ہیں، وہاں کوئی شخص بیٹھ جائے تو مؤذن صاحب کے لئے اس کو ہٹانا جائز نہیں ہے:

ویکرہ أشد کراھة أن یقیم الرجل أخاہ فیجلس في موضعه في الجمعة وغیرھا، قال الکرماني وظاھر النھی الوارد فیه التحریم، لأن من سبق إلی مباح فھو أحق به... ولو فرش له نحو سجادة ففیه وجھان: فقیل یجوز لغیرہ تنحیتھا والجلوس في موضعھا، لأن السبق بالأجسام لا بما یفرش ولا یجوز الجلوس علیھا بغیر رضاہ.....الخ (طحطاوي علی المراقي، کتاب الصلاۃ، باب الجمعة، دار الکتاب دیوبند جدید: ۵۲۳) وعندي في النھی عن توطین الرجل مکانا معینا في المسجد وجه آخر، وھو أنه إذا وطن المکان المعین في المسجد یلازمه، فإذا سبق إلیه غیرہٗ یزاحمه، ویدافعه عنه، وھو لا یجوز؛ لقوله علیه السلام: لا منی مناخ من سبق، فکما ھو حکم منی، فھو حکم المسجد، فمن سبق إلیٰ موضع منه، فھو أحق به، فعلی ھذا لو لازم أحد أن یقوم خلف الإمام قریبا منه؛ لأجل حصول الفضل، وسبق إلیه من القوم أحد لا یزاحمه ولا یدافعه، فلا یدخل في ھذا النھی۔ (بذل المجھود ۱۵۰/۴، دار البشائر الاسلامیه)

سوال.....: تکبیرات انتقالیہ کا وقت اور اس کا حکم کیا ہے؟

جواب.....: تکبیرات انتقالیہ سنت ہے، اور اس کا وقت یہ کہ ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہوتے ہوئے تکبیر کہہ لے اور انتقال کے اختتام کے ساتھ ساتھ تکبیر بھی پوری کردے۔

نوٹ: بعض لوگ ایک رکن مکمل ہونے کے بعد اگلے رکن میں تکبیر کہتے ہیں، اس طرح کرنا مکروہ ہے:

(ویرکع حین یفرغ من القراءۃ وھو منتصب) ھو المذھب الصحیح، کذا في الخلاصة في الجامع الصغیر، ویکبر مع الانحطاط، کذا في الھدایة، قال الطحاوي: وھو الصحیح، کذا في معراج الدرایة، فیکون ابتداء تکبیرہ عند أول الخرور والفراغ عند الاستواء للرکوع. (فتاویٰ ھندیه 1/74 ط:سعید)

(ویُکرہ) أن یأتي بالأذکار المشروعة في الانتقالات بعد تمام الانتقال بأن یکبر للرکوع بعد الانتھاء إلی حد الرکوع ویقول: سمع اللہ لمن حمدہ، بعد تمام القیام (کبیري: ۳۵۷)

افسانہ

قصہ چہار درویش

قسط: ۱۳ از: میر امن دہلوی

(سیر دوسرے درویش کی:)

یہ ماجرا تم نے سب سنا۔ اپنے دل میں غور کرو، اگر تم اس جوان کی خبر لاسکو تو قصد ملک نیم روز کا کرو اور جلد روانہ ہو۔ نہیں تو انکار کر کر اپنے گھر کی راہ لو، میں نے جواب دیا کہ اگر خدا چاہے تو جلد اس کا احوال سر سے پاؤں تک دریافت کر کر بادشاہ زادی تک آ پہنچتا ہوں اور کامیاب ہوتا ہوں۔ اور جو میری قسمت بدتر ہے تو اس کا کچھ علاج نہیں، لیکن ملکہ اس کا قول اقرار کریں کہ اپنے کہنے سے نہ پھریں۔ اور بالفعل ایک اندیشہ مشکل میرے دل میں خلش کر رہا ہے۔ اگر ملکہ غریب نوازی اور مسافر پروری سے حضور میں بلاویں اور پردے کے باہر بٹھلا دیں اور میرا التماس اپنے کانوں سنیں اور اس کا جواب اپنی زبان سے فرمادیں تو میری جان جمع ہو، اور مجھ سے سب کچھ ہو سکے۔ یہ میرے مطلب کی بات اس ماما نے روبرو اس پیکر کے عرض کی، بارے قدردانی کی راہ سے حکم کیا کہ انہیں بلالو۔

دائی پھر باہر آئی اور مجھے اپنے ساتھ جس محل میں بادشاہ زادی تھی، لے گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو رویہ صف باندھے دست بستہ سہیلیاں اور خواصیں اور ارواپیگیاں قلماقنیاں، ترکیناں، حبشیاں، ازبکنیاں، کشمیرنیاں جواہر میں جڑی عہد لئے کھڑی ہیں۔ اندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اتارا؟ بے اختیار ایک آہ بے خودی سے زباں تک آئی اور کلیجہ تہلکے لگا۔ پر بہ زور اپنے تئیں تھانبا۔ ان کو دیکھتا بھالتا اور سیر کرتا آگے چلا، لیکن پاؤں سو سو من کے ہو گئے۔ جس کو دیکھو پھر یہ نہ جی چاہے کہ آگے جاؤں۔ ایک طرف چلون پڑی تھی اور مونڈھا جڑاؤ بچھوا رکھا تھا، اور ایک چوکی بھی صندل کی بچھی ہوئی تھی۔ دائی نے مجھے بیٹھنے کی اشارت کی۔ میں مونڈھے پر بیٹھ گیا اور وہ چوکی پر، کہنے لگی لو اب جو کہنا ہے سو جی بھر کر کہو۔

میں نے ملکہ کی خوبیوں کی اور عدل و انصاف۔ داد و دہش کی پہلے تعریف کی پھر کہنے لگا۔ جب سے میں اس ملک کی سرحد میں آیا، ہر ایک منزل میں یہی دیکھتا کہ جا بجا مسافر خانے اور عمارتیں عالی بنیں ہوئیں ہیں اور آدمی ہر ایک عہدے کے تعینات ہیں کہ خبر گیری مسافروں کی کرتے ہیں۔ مجھے بھی تین دن ہر ایک مقام میں گزرے، چوتھے روز جب رخصت ہونے لگا تب کسو نے خوشی سے نہ کہا کہ جاؤ۔ اور جتنا اسباب اس مکان میں تھا، شطرنجی، چاندی، قالین، ستیل پانی، منگل کوٹی، دیوار گیری، چھت پردے، چلونیں، سائبان، نم گیرے، چھپر کھٹ مع غلاف، اوقچہ، توشک، بالا پوش، س اِتیج بند، چادر تکیے، تکینی، گل تکیے، مسند، گاؤ تکیے، دیگ دیگچے، پتیلے، طباق، رکابی، با دیئے، تشتری، چمچے، بکاؤلی، کف گیر، طعام بخش، سرپوش،

سینی، خوان، پوش، تورہ پوش، آبخورے، بجھڑے، صراحی، لگن، پان دان، چوگھرے، چنگیر، گلاب پوش، عود، سوز، آفتابہ، چلمچی سب میرے حوالے کیے کہ یہ تمہارا مال ہے، چاہو اب لے جاؤ، نہیں تو ایک کوٹھڑے میں بند کر کر اپنی مہر کرو۔ جب تمہاری خوشی ہوگی پھرتے ہوئے لے جائیو۔ میں نے یوں ہی کیا۔ پر یہ حیرت ہے کہ جب مجھ سے فقیر تنہا سے یہ سلوک ہوا۔ تو ایسے غریب ہزاروں تمہارے ملکوں میں آتے جاتے ہوں گے۔ پس ہر ایک سے یہی مہمان داری کا طور رہتا ہوگا، تو مبلغ بے حساب خرچ ہوتی ہوں گے۔ پس اتنی دولت کہ جس کا یہ صرف ہے، کہاں سے آئی اور کیسی ہے؟ اگر گنجِ قارون ہو تو بھی وفا نہ کرے۔ اور ظاہری میں اگر ملکہ کی سلطنت پر نگاہ کیجئے، تو اس کی آمد فقط باورچی خانے کے خرچ کو بھی کفایت نہ کرتی ہوگی۔ اور خرچوں کا تو کیا ذکر ہے۔ اگر اس کا بیان ملکہ کی زبان سے سنوں تو خاطر جمع ہو، قصد ملک نیم روز کا کروں اور جوں توں وہاں جا پہنچوں، پھر سب احوال دریافت کر کے ملکہ کی خدمت میں بہ شرط زندگی بار دگر حاضر ہوں، اپنے دل کی مراد پاؤں۔

یہ سن کر ملکہ نے اپنی زبان سے کہا کہ اے جوان! اگر تجھے آرزو کمال ہے کہ یہ ماہیت دریافت کرے، تو آج کے دن بھی مقام کر۔ شام کو تجھے حضور میں طلب کر کر جو کچھ احوال اس دولتِ بے زوال کا ہے، بے کم و کاست کہا جائے گا۔ میں یہ تسلی پا کر اپنی استقامت کے مکان پر آ کر منتظر تھا کہ کب شام ہو جو میرا مطلب تمام ہو۔ اتنے میں خواجہ سرا کئی چوگاشے تورہ پوش پڑے بھوئیوں کے سر پر دھرے آ کر موجود ہوا اور بولا کہ حضور سے الش خاص عنایت ہوا ہے اس کو تناول کرو۔ جس وقت میرے سامنے کھولے بو باس سے دماغ معطر ہوا اور روح بھر گئی۔ جتنا کھا سکا کھا لیا۔ باقی ان سبھوں کو اٹھا دیا اور شکر نعمت کہہ بھیجا یا۔

بارے آفتاب تمام دن کا مسافر تھکا ہوا، گرتا پڑتا اپنے محل میں داخل ہوا اور ماہتاب دیوان خانے میں اپنے مصاحبوں کو ساتھ لے کر نکل بیٹھا، اس وقت دائی آئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ چلو بادشاہ زادی نے یاد فرمایا ہے۔ میں اس کے ہمراہ ہو لیا، خلوت خاص میں لے گئی۔ روشنی کا یہ عالم تھا کہ شب قدر کو وہاں قدر نہ تھی اور بادشاہی فرش پر مسند مغرق بچھی ہوئی مرصع کا تکیہ لگا ہوا اور اس پر ایک شمیانہ موتیوں کا جھالر کا جڑاؤ استادوں پر کھڑا ہوا۔ اور سامنے مسند کے جواہر کے درخت پھولوں پات لگے ہوئے، گویا عین قدرتی ہیں۔ سونے کی کیاریوں میں جمے ہوئے اور دونوں طرف دست چپ شاگرد پیتے اور مجرائی دست بستہ، باادب آنکھیں نیچی کئے ہوئے حاضر تھے اور طوائفیں اور گائنیں سازوں کے سُر بنائے منتظر۔ یہ سماں اور یہ تیاری کر و فر دیکھ کر عقل ٹھکانے نہ رہی۔ دائی سے پوچھا کہ دن کو وہ زیبائش اور رات کو یہ آرائش کہ دن عید اور رات شب برات کہا چاہیے۔ بلکہ دنیا میں بادشاہت ہفت اقلیم کو یہ عیش میسر نہ ہوگا۔ کیا ہمیشہ یہی صورت رہتی ہے؟ دائی کہنے لگی کہ ہماری ملکہ کا جتنا کارخانہ تم نے دیکھا یہ سب اسی دستور سے جاری ہے۔ اس میں ہرگز خلل نہیں۔ بلکہ افزوں ہے۔ تم یہاں بیٹھوں دوسرے مکان میں تشریف رکھتی ہیں، جا کر خبر کروں۔

دائی یہ کہہ کر گئی اور انہی پاؤں پھر آئی کہ چلو حضور میں۔ یہ مجرد اس مکان میں جاتے ہی بھیچک رہ گیا۔ نہ معلوم ہوا کہ دروازہ کہاں اور دیوار کدھر ہے اور اس واسطے کہ آئینے قدم آدم چاروں طرف لگے اور ان کی پروازوں میں ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے۔ ایک کا عکس ایک میں نظر آتا تو یہ معلوم ہوتا کہ جواہر کا سارا مکان ہے۔ ایک طرف پردہ پڑا تھا۔ اس کے

پیچھے ملکہ بیٹھی تھیں۔ وہ دائی پردے سے لگ کر بیٹھی اور مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔ تب دائی ملکہ کے فرمانے سے اس طور پر بیان کرنے لگی کہ سن اے جوان! دانا! سلطان اس اقلیم کا بڑا بادشاہ تھا۔ اس کے گھر سات بیٹیاں پیدا ہوئیں، ایک روز بادشاہ نے جشن منایا۔ یہ ساتوں لڑکیاں سولہ یہ ساتوں لڑکیاں سولہ سنگار، بارہ ابھرن بال بال گنج موتی پرو کر بادشاہ کے حضور کھڑی تھیں۔ سلطان کے کچھ جی آیا تو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ اگر تمہارا باپ بادشاہ نہ ہوتا اور کسی غریب کے گھر تم پیدا ہوتیں، تو تمھیں بادشاہ زادی اور ملکہ کون کہتا؟ خدا کا شکر کرو کہ شہزادیاں کہلاتی ہو، تمہاری یہ ساری خوبی میرے دم سے ہے، چھے لڑکیاں ایک زبان ہو کر بولیں کہ جہاں پناہ جو فرماتے ہیں بجا ہے، اور آپ ہی کی سلامتی سے ہماری بھلائی ہے۔ لیکن یہ ملکہ پناہ سب بہنوں سے چھوٹی تھیں، پر عقل و شعور میں اس عمر میں بھی گویا سب سے بڑی تھیں۔ چپکی کھڑی رہیں۔ اس گفتگو میں بہنوں کی شریک نہ ہوئیں۔ اس واسطے کہ یہ کلمہ کفر کا ہے۔

بادشاہ نے نظرِ غضب سے ان کی طرف دیکھا اور کہا کیوں بی بی تم کچھ نہ بولیں اس کا کیا باعث ہے؟ تب ملکہ نے اپنے دونوں ہاتھ رومال سے باندھ کر عرض کی کہ اگر جان کی امان پاؤں اور تقصیر معاف ہو تو یہ لونڈی اپنے دل کی بات گزارش کرے۔ حکم ہوا کہ کیا کہتی ہے؟ تب ملکہ نے کہا کہ قبلہ عالم آپ نے سنا ہے کہ سچ بات کڑوی لگتی ہے سو اس وقت میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر عرض کرتی ہوں، اور جو کچھ میری قسمت میں لکھنے والے نے لکھا ہے اس کا مٹانے والا کوئی نہیں۔ کسو طرح نہیں ٹلنے کا۔

خواہ تم پاؤں گھسو یا کہ رکھو سر بسجود　　بات پیشانی کی جو کچھ ہے سو پیش آتی ہے

جس بادشاہ علی الاطلاق نے آپ کو بادشاہ بنایا۔ انہیں نے مجھے بھی بادشاہ زادی کہلوایا۔ اس کی قدرت کے کارخانے میں کسو کا اختیار نہیں چلتا۔ آپ کی ذات ہماری ولی نعمت اور قبلہ و کعبہ ہے۔ حضرت کے قدم مبارک کی خاک کو سرمہ کروں تو بجا ہے۔ مگر نصیب ہر ایک کے ہر ایک کے ساتھ ہیں۔ بادشاہ سُن کر طیش میں آئے اور جواب دل پر سخت گراں معلوم ہوا۔ بیزار ہو کر فرمایا۔ چھوٹا منہ بڑی بات، اب اس کی یہی سزا ہے کہ گہنا پاتا جو کچھ اس کے ہاتھ گلے میں ہے، اُتار لو۔ اور ایک میانے میں چڑھا کر ایسے جنگل میں کہ جہاں نام و نشان آدمی زاد کا نہ ہو، پھینک آؤ۔ دیکھیں اس کے نصیبوں میں کیا لکھا ہے۔

بموجب حکم بادشاہ کے اس آدھی رات میں کہ عین اندھیری تھی، ملکہ کو جو نرے بھونرے میں پلی تھیں اور سوائے اپنے محل کے دوسرے جگہ نہ دیکھی تھی، بھولی لے جا کر ایک میدان میں کہ وہاں پرندہ پر نہ مار سکتا، انسان کو تو کیا ذکر ہے، چھوڑ کر چلے آئے۔ ملکہ کے دل پر عجب حالت گزرتی تھی کہ ایک دم میں کیا تھا اور کیا ہو گیا؟ پھر اپنے خدا کی جناب میں شکر کرتیں اور کہتیں تو ایسا ہی بے نیاز ہے، جو چاہا سو ہو گیا۔ اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے اور جو چاہے گا سو کرے گا۔ جب تلک نتھنوں میں دم ہے، تجھ سے ناامید نہیں ہوتی۔ اسی اندیشے میں آنکھ لگ گئی۔ جس وقت صبح ہونے لگی ملکہ کی آنکھ کھُل گئی۔ پُکاریں کہ وضو کا پانی لانا۔ پھر ایک بارگی رات کی بات چیت یاد آئی کہ تو کہاں اور یہ بات کہاں؟ یہ کہہ کر اٹھ کر تیمّم کیا اور دوگانہ شکر کا پڑھا۔ اے عزیز، ملکہ کی اس حالت کے سننے سے چھاتی پھٹتی ہے۔ اس بھولے بھالے جی سے پوچھا چاہیے کہ کیا کہتا ہوگا۔　　(جاری)

جامعۃ السعادۃ واسعاد البنات کیرانہ

شاخ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

''جامعۃ السعادۃ'' مغربی یوپی کے مردم خیز قصبہ ''کیرانہ، شاملی'' کا ایک عظیم ومنفرد ادارہ ہے۔جس کے مقاصد میں سے قرآن وحدیث کی ترویج واشاعت کے ساتھ، ایسے باصلاحیت رجال کار تیار کرنا ہے، جو ملت اسلامیہ کی علمی، دینی اور فکری قیادت کا فریضہ انجام دے سکیں اور اپنی خوابیدہ قوم کو بیدار کرسکیں۔

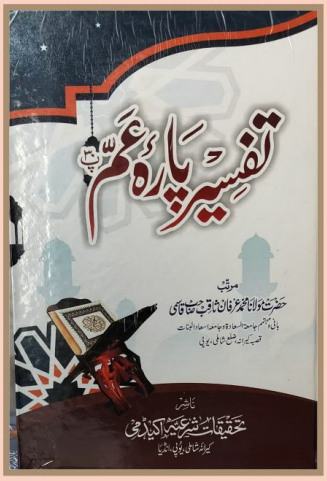
یہ ادارہ ۱۴۲۸ھ سے علم کی شمع جلانے اور اس کی لو کو تیز کرنے میں مصروف ہے، بچوں اور بچیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ، عربی، اردو اور انگریزی زبان بولنے ولکھنے کی ان کے اندر صلاحیت پیدا کرنے اور صحیح ڈھنگ سے ان کی تربیت کرنے، نیز عوام الناس میں دینی بیداری پیدا کرنے اور انہیں اسلامی تعلیمات سے واقف کرانے کے لئے اس کے خصوصی تعلیمی وتربیتی پروگرام اور انتہائی علمی ووقیع رسالہ ''تحقیقات اسلامی'' کی پابندی کے ساتھ اشاعت ایسے کارنامے ہیں کہ کم ہی ادارے اس قلیل مدت میں اس منزل کو حاصل کر پاتے ہیں۔جامعہ کی مستقل اپنی انتہائی خوبصورت ودیدہ زیب دومنزلہ عمارت ہے، جس میں تعلیمی، تربیتی اور دعوتی ۱۴ رشعبے قائم ہیں۔طلبہ کی ایک کثیر تعداد دارالاقامہ میں مقیم ہے جن کے قیام وطعام اور لباس وفوری علاج کا جامعہ میں انتظام ہے اور دیگر ہر طرح کی سہولیات انہیں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

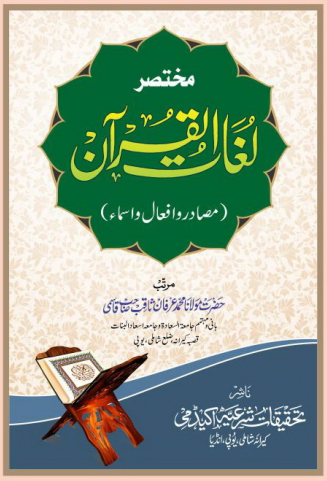
جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملحق ہے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی کے نصاب کے مطابق ثانویہ اولیٰ سے عالیہ ثانیہ تک کی تعلیم کے ساتھ حفظ مع تجوید، ناظرہ قرآن کریم، دینیات اور حکومت ہند سے منظور شدہ: جامعۃ السعادۃ للدارین پبلک اسکول کے تحت درجہ آٹھ تک کی تعلیم ماہر اساتذہ کی نگرانی میں جاری ہے۔

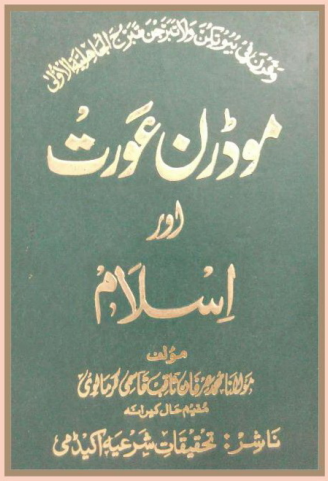
جب کہ بچیوں کی خصوصی تعلیم وتربیت کے لئے علاحدہ سے ''جامعہ اسعاد البنات'' قائم ہے۔اس کی بھی دومنزلہ انتہائی محفوظ، خوبصورت اور ہر طرح کی سہولیات سے مزین عمارت ہے۔بچیوں کی نگرانی اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے باصلاحیت عالمائیں مامور ہیں، یہ ادارہ بھی ندوۃ العلماء سے ملحق ہے۔جس میں ندوہ ہی کے نصاب ونظام کے مطابق از درجہ پرائمری تا دورہ حدیث شریف کی تعلیم جاری ہے، ساتھ ہی کمپیوٹر اور دست کاری (سلائی، کڑھائی، امور خانہ داری) بھی سکھائی جاتی ہے۔

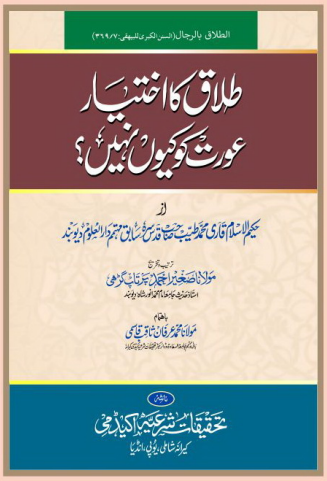
جامعہ کی مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔مخیّر حضرات سے اپیل ہے کہ صدقات، زکوٰۃ اور عطیات کی رقوم سے جامعہ کا تعاون فرمائیں۔ **ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین**

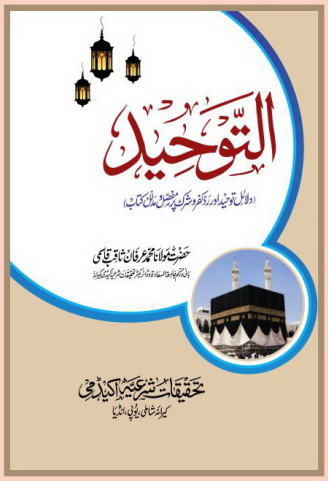
محمد عرفان ثاقب قاسمی
محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ، کیرانہ ضلع شاملی۔یوپی 247774
رابطہ نمبر: 09319530768 / 9359602830























JAMIATUS SA'ADAH
Moh.Ibrahim Pura, (Aal Kalan) Shamli Road,
Kairana, Distt. Shamli U.P Pin: 247774
Mob: 09359602830, 09319530768